سہ ماہی

علمی و تحقیقی مجلّہ

نورِ معرفت

29

☆اداریہ
☆عیون اخبار الرضاؑ
☆حج کی اہمیت اور فلسفہ
☆تعلیم وتربیت کی اہمیت
☆اسلامی ریاست کا تصور اور ضرورت
☆علامہ اقبال کی احیائے اجتہاد کی کوششیں
☆معاصر اسلامی ریاستوں میں ذرائع ابلاغ کے مناہج
☆کربلا، خودی کی سربلندی اور انسانی کرامت کی معراج
☆صدر اسلام میں مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات پر ایک نظر

کلام الامام، امام الکلام

دعا کرنے کا طریقہ

وَ قالَ عَلَيْهِ السَّلامُ: إذا كانَتْ لَكَ إلَى اللّهِ سُبْحانَهُ ،حاجَةٌ فَابْدَأْ بِمَسْأَلَةِ الصَّلاةِ عَلى رَسُولِهِ صَلَّى اللّهُ عَلَيْهِ وَ آلِهِ، ثُمَّ سَلْ حاجَتَكَ، فَإِنَّ اللّهَ أَكْرَمُ مِنْ أَنْ يُسْأَلَ حاجَتَيْنِ فَيَقْضِيَ إحْدَاهُما وَيَمْنَعَ الأُخْرىٰ۔

یعنی: ''امام علی علیہ السلام نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ سے کوئی حاجت طلب کرو، تو پہلے رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجو، پھر اپنی حاجت مانگو، کیونکہ خداوند عالم اس سے بلند تر ہے کہ اس سے دو حاجتیں طلب کی جائیں اور وہ ایک پوری کر دے اور ایک روک لے۔''

(حضرت امام علی علیہ السلام، نہج البلاغہ، کلمات قصار ۳۶۱)

بسم الله الرحمن الرحيم

اہل قلم سے اپیل

سہ ماہی "نور معرفت" ایک علمی و تحقیقی جریدہ ہے۔ یہ جریدہ ملک کے اعلی تعلیم یافتہ طبقہ کی علمی پیاس بجھانے کے لئے شائع کیا جارہا ہے۔ جہاں اس جریدے کا ہدف عامۃ الناس کے اذہان کو علم کی ضیاء پاشیوں سے منور کرنا ہے، وہاں اس کا ایک اہم ہدف، دینی مدارس اور یونی ورسٹیوں کے اساتذہ اور طلاب کے درمیان علمی و تحقیقی شوق و جستجو پیدا کرنا بھی ہے۔ اس حوالے سے یہ جریدہ ہر دین دار عالم و دانشور کے علمی اور قلمی تعاون کا محتاج ہے۔ اس جریدے میں علوم قرآن و حدیث، فقہ و اصول فقہ، کلام و فلسفہ؛ اسلامی تاریخ، تقابل ادیان، تعلیم و تدریس، ادبیات، معاشیات، عمرانیات، سیاسیات، اقبالیات، ثقافت و تمدن، قانون و اصول قانون وغیرہ پر اسلامی نقطہ نظر سے مقالات کے علاوہ علمی کتابوں پر تبصرے شائع کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہماری اپیل ہے کہ اپنی گراں قدر علمی آراء، تحقیقات اور نگارشات اس جریدہ کو ارسال کریں۔

چند ضروری ہدایات

- مقالہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ اپنے تحقیقی مقالات مدیر نور معرفت کے نام ارسال کریں۔
- بہتر ہے کہ مضمون کمپوز شدہ ہوں اور ان کی ضخامت بیس /پچیس صفحات سے زائد نہ ہو۔ ممکن ہو تو مضمون کی سافٹ کاپی بھی ارسال کریں یا مدیر کے ای۔ میل پر ارسال کی جائے۔
- ترجیحی بنیادوں پر ایسے موضوعات پر تحقیق کی جائے جو ادارہ تجویز کرے۔
- حواشی اور حوالہ جات کے لئے اصلی مآخذ اختیار کریں اور مضمون کے آخر میں ***Turabian Style*** میں درج ذیل ترتیب کے مطابق لکھے جائیں:

مصنف کا لقب، مصنّف کا نام؛ کتاب کا نام، پبلشر کا نام؛ سن طباعت؛ جلد؛ صفحہ نمبر۔ مثال کے طور پر:

طباطبائی، محمد حسین، المیزان فی تفسیر القرآن، منشورات جامعۃ المدرّسین، ۱۳۷۵ھ، ش، ج۹، ص۱۶۶، قم، ایران۔

- نور معرفت میں شائع شدہ مقالات کسی اور جگہ طبع کرانے کی صورت میں مجلّہ ہذا کا حوالہ دینا ضروری ہے۔
- مجلّہ، مقالات کی ادبی، فنّی اور ظاہری آرائش اور عبارتوں کی تہذیب کا حق رکھتا ہے۔
- ادارے کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں؛ لہٰذا مجلّہ ارسال شدہ مقالات کی علمی آرائش اور تہذیب کا حق بھی رکھتا ہے۔

Declaration No: 7334

ISSN 2221-1659

سہ ماہی

علمی و تحقیقی

نور معرفت

جلد: ۶
رمضان المبارک
تا
ذیقعدة
۱۴۳۶ھ
بمطابق
جولائی تا ستمبر
2015
شمارہ: ۳

مدیر اعلیٰ
سید حسنین عباس گردیزی

مدیر
سید رمیز الحسن موسوی

مجلس ادارت

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین
ڈاکٹر سید راشد عباس
ڈاکٹر علی رضا طاہر
سید ثمر علی نقوی
ڈاکٹر ساجد علی سبحانی
ڈاکٹر کرم حسین ودھو
سید علی مرتضیٰ زیدی
روشن علی

کمپوزنگ / ڈیزائننگ: بابر عباس
پرنٹرز: پکٹوریل پریس، آبپارہ، اسلام آباد

قیمت فی شمارہ 130 روپے
زرِ سالانہ 500 روپے
زرِ سالانہ 150 ڈالر امریکہ، کینیڈا، یورپ
زرِ سالانہ 070 ڈالر مڈل ایسٹ

نور الہدیٰ مرکز تحقیقات، نور الہدیٰ ٹرسٹ، محلہ سادات، بارہ کہو اسلام آباد
www.nmt.org.pk | www.nht.org.pk
E-MAIL: NOOR.MARFAT@GMAIL.COM

نوٹ: ادارے کا مقالہ نگار کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرست

نمبر شمار	موضوع	مؤلف	صفحہ
۱	اداریہ	مدیر	۷
۲	اسلامی ریاست کا تصور اور ضرورت	ڈاکٹر سجاد علی	۱۱
۳	علامہ اقبال کی احیائے اجتہاد کی کوششیں	گل واحد	۳۱
۴	تعلیم وتربیت کی اہمیت (افکارِ امام خمینیؒ کی روشنی میں)	سید رمیز الحسن موسوی	۴۷
۵	معاصر اسلامی ریاستوں میں ذرائع ابلاغ کے مناہج	ڈاکٹر محمد ریاض	۶۳
۶	صدر اسلام میں مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات پر ایک نظر	ڈاکٹر محمد افضل	۸۹
۷	حج کی اہمیت اور فلسفہ (نہج البلاغہ کی روشنی میں ایک مطالعہ)	روشن علی	۱۱۹
۸	کربلا، خودی کی سربلندی اور انسانی کرامت کی معراج	ڈاکٹر شیخ محمد حسنین	۱۳۳
۹	عیون اخبار الرضا (ع)	سید رمیز الحسن موسوی	۱۴۵

"نمُت" ایک نظر میں

" نور الہدیٰ مرکز تحقیقات"، نور الہدیٰ ٹرسٹ کا ایک ذیلی ادارہ ہے جسے بطورِ اختصار "نمت" (NMT) پڑھا لکھا جاتا ہے۔ یہ ادارہ فاضل علماء کرام اور دانشوروں کی رہنمائی میں کام کر رہا ہے اور اِسے جن شخصیات کی سرپرستی حاصل ہے اُن کی اکثریّت حوزہ علمیہ قم سے تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ، معروف انٹرنیشنل یونیورسٹیز سے بھی تعلیم یافتہ اور مختلف جامعات میں تدریس و تحقیق کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ "نمت" کو جہاں اندرونِ ملک سے علماء اور دانشوروں کی ایک ٹیم کا تعاون اور رہنمائی حاصل ہے، وہاں اسے عالمِ اسلام کے بعض بین الاقوامی علمی مراکز کے فاضل علماء کرام کا قلمی تعاون اور فکری رہنمائی بھی حاصل ہے۔

"نمت" کا نصب العین (Vision) مملکتِ خداداد پاکستان میں اسلامی تہذیب کی تشکیل کی ٹھوس فکری بنیادیں فراہم کرنا ہے۔ اسلام کی حقیقی تعلیمات کی ترویج کے ذریعے پاکستانی قوم میں دینی آگہی کا فروغ اور قومی شعور بیدار کرنا "نمت" کا مشن (Mission) ہے۔ "نمت" کے اہداف (Goals) درج ذیل ہیں:

۱۔ محققین کے درمیان رابطہ اور ہماہنگی ایجاد کرنا۔

۲۔ نشر واشاعت کے عمل میں قومی رسائل وجرائد کے ساتھ تعاون۔

۳۔ اسلامی تعلیمات کے تحقیق طلب موضوعات پر تحقیقات پیش کرنا۔

۴۔ قومی اور معاشرتی مسائل کا اسلامی تعلیمات کے نکتۂ نظر سے حل پیش کرنا۔

۵۔ ملت مسلمہ کے افراد کو درپیش عقیدتی اور فکری شبہات اور سوالات کا جواب پیش کرنا۔

۶۔ دینی مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طالبعلموں میں تحقیق کا جذبہ اجاگر کرنا۔

جہاں تک "نمت" کی پالیسیوں (Policies) کا تعلق ہے تو ملکی سالمیت اور مملکت خداداد پاکستان میں اسلامی تہذیب کی حکمرانی کی غرض سے پاکستان کے قومی نظریہ (نظریۂ توحید) کو اجاگر کرنا اور پاکستانی قوم کے اندر یکجہتی اور وحدت کا شعور بیدار کرنا، اس ادارے کی اساسی پالیسی ہے۔ "نمت" کی پالیسی یہ ہے کہ اسلام کی حقیقی تعلیمات کی ترویج کے ذریعے اس قوم میں پائی جانے والی بیمار دینی سوچ کا معالجہ اور فکری پسماندگی کا خاتمہ کیا جائے؛ تاکہ یہاں اسلامی تہذیب حاکم ہوسکے۔

"نمت" کی تگ و دَو اور سرگرمیوں کا دائرہ کار محض تعلیمی، تحقیقی میدان میں فعالیت میں محدود ہے اور یہ اپنے اہداف کے حصول کے لئے مختلف اسلامی فرقوں اور مذاہب کے درمیان بین المسالک ہماہنگی، تعمیری ڈائیلاگ اور درک متقابل کا قائل ہے۔ یہ ادارہ کسی خاص شخصیت کی تصنیفات پیش کرنے کی بجائے، ہر اپنے اہداف سے ہماہنگ، ہر تحقیقی کاوش کو اپنے دامنِ نشر و اشاعت میں جگہ دینے کا عہد کیے ہے۔ ہمفکر محققین کی تربیت بھی "نمت" کی اساسی پالیسی ہے۔ لہٰذا دینی مدارس کے اساتذہ، محققین، دینی اسکالرز، کالجز، یونیورسٹیز کے طلباء وطالبات، اہل قلم اور دانشور حضرات ہمارے خاص مخاطب شمار ہوتے ہیں۔

تحقیق کے میدان میں "نمت" کا منہج بڑا واضح ہے۔ ہمارے منابع میں قرآن کریم سرفہرست ہے۔ اور ہم سنّت نبوی کے اُس طریق پر اعتماد کرتے ہیں جو ائمہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کا طریق ہے۔ ان منابع سے دینی تعلیمات کے اخذ و استخراج میں ہم مکتب تشیع کی اُس علمی تحقیقی روش کے علمبردار ہیں جو دینِ اسلام کے بنیادی منابع میں تتبّع، تفحّص اور اجتہاد کی بنیادوں پر استوار ہے۔

جہاں تک "نمت" کی کارکردگی کا تعلق ہے تو اب تک یہ ادارہ مختلف موضوعات پر 13 کتابیں اور سہ ماہی مجلّہ "نور معرفت" کے 28 شمارے (تقریباً 267 علمی، تحقیقی مقالات) پیش کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ، یہ ادارہ اب تک 8 سالانہ علمی سیمینارز کا انعقاد بھی کر چکا ہے اور ادارے کی ویب سائٹ بھی قابلِ استفادہ بنائی جا رہی ہے۔ بہر صورت، "نمت" کو اپنے تحقیقاتی منصوبے جاری رکھنے کے لئے دانشوروں، علماء اور اہل قلم کے قلمی اور فکری تعاون کے ساتھ ساتھ علم دوست احباب کا مالی تعاون بھی درکار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے کرم فرماؤں کو اس ادارے کے لئے بہتر سے بہتر وسائل فراہم کرنے کے توفیق عطا فرمائے! (آمین!)

ڈائریکٹر "نمت"

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین

اداریہ

''نور معرفت'' جیسے جرائد کے وجود کا فلسفہ انسانی علوم و معارف کی اشاعت اور معاشرے میں انسانی قدروں کی ترویج ہے۔انسانی قدروں اور معارف کا سب سے بڑا منبع قرآن مجید ہے جو تعمیر انسانیت کی کتاب ہے۔ قرآن کے بعد پیغمبر اکرم ﷺ کی سیرت اور سنت ہے کہ جو کتاب الٰہی کی عملی تفسیر ہے اور سیرت و سنت رسولؐ کی محافظ اور مروج، عترت رسولؐ ہے کہ جسے خود پیغمبر اکرم ﷺ نے حدیث ثقلین میں قرآن مجید کے بعد ''ثقل اصغر'' کے نام سے متعارف کرایا ہے۔ لیکن قرآن مجید، رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور اہلبیت اطہارؑ کے معارف کے فہم کی کلید، عقل ہے، جس کا فہم دین میں بہت بڑا کردار ہے۔ عقل کے بغیر نہ تو خداوند متعال کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور نہ نبوت کے مقام و منزلت کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ قرآن مجید کے معارف سے بہرہ مند ہوا جاسکتا ہے۔ یہ عقل ہی ہے جس کے ذریعے اہل بیت رسولؐ اور اولیائے خدا کی ولایت کا ادراک کیا جاتا ہے۔امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرمان کے مطابق: عقل ہی کے ذریعے خدا کی عبادت ہوتی ہے، بہشت حاصل کی جاتی ہے۔ عقل کو معطل کرنے کا مطلب خدا سے تعلق ختم کر دینا اور کلام خدا کے فہم کے دروازے بند کر دینا ہے۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خداوند متعال کی اہم ترین معنوی نعمتوں میں قرآن مجید، رسول اللہ ﷺ کے وجود مقدس اور اہل بیت اطہارؑ جیسے سلسلۂ ہدایت کے بعد عقل سب سے بڑی نعمت ہے۔ عقل کی اہمیت سورۂ مُلک کی اس آیت سے واضح ہوتی ہے کہ جس کے مطابق قرآن مجید اہل جہنم کے بارے میں خبر دیتا ہے کہ تم اپنے جہنمی ہونے کا سبب بیان کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ''لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ'' یعنی: ''اگر ہم معرفت وشناخت کے آلات کا کہ جن میں سے ایک کان ہیں، درست استعمال کرتے اور عقل سے کام لیتے تو آج جہنم میں نہ ہوتے۔''

اسلام خدا کی معرفت اور سعادت و نجات کی اساس وبنیاد، عقل وخرد کو قرار دیتا ہے اور جگہ جگہ اس کا روئے سخن ''اولوالالباب'' (صاحبان عقل) اور ''اولوالابصار'' (صاحبان بصیرت) کی طرف ہے۔

اسلامی معاشروں میں دینی علوم ومعارف کی ترویج اور نشرواشاعت کا سب سے بڑا مقصد عقل کے دروازے کو ہمیشہ کھلا رکھنا اور اس نعمت خداوندی کو زمانے کے گردوغبار سے محفوظ رکھنا ہے۔ جس معاشرے میں عقل کو شہوت، مادیت، حرص ولالچ، حسد وتکبر، تعصب وعناد جیسی آفات گھیر لیں، اُس معاشرے میں قرآن مجید جیسی الٰہی کتاب مہجور، سیرت رسول اللہ ﷺ نظرانداز اور ائمہ اہل بیتؑ جیسی ہستیاں گوشہ نشین ہو جاتی ہیں۔

اس وقت "نور معرفت" جیسے جرائد کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ آیات قرآن کو کسمپرسی سے نکالیں اور سیرت رسول اللہ ﷺ کے لئے میدان عمل فراہم کریں اور اہل بیت اطہارؑ کے معارف کی نشرواشاعت اور قرآنی ونبوی تعلیمات کے ذریعے فہم دین کے عقلی دروازے کھولیں۔

لیکن جب دینی علوم ومعارف کی نشرواشاعت اور ترویج کے دعویٰ دار ادارے، جرائد اور مدارس ہی عقل وخرد کو پس پشت ڈال کر تعصب وعناد، دنیوی حرص ولالچ جیسی آفات میں مبتلا ہو جائیں اور ان باتوں کے مروّج بن جائیں تو اسلامی معاشروں کا زوال وانحطاط یقینی بن جاتا ہے۔

اس وقت ہمارے موجودہ معاشرے اور اس پر حاکم سیاسی واجتماعی نظام اور اخلاقی صورت حال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاشرے میں دینی علوم ومعارف کی نشرواشاعت کے دعویٰ دار ادارے، جرائد اور شخصیات، قرآنی تعلیمات، سیرت رسولؐ اور اہل بیت اطہارؑ کی محبت ومودّت اور صحابہ کرامؓ سے اظہار عقیدت کا پرچار کرنے کے باوجود، قرآن، سیرت رسولؐ اور اہل بیتؑ وصحابہ کرامؓ کا مطلوبہ معاشرہ قائم کرنے میں ناکام ہو چکے ہیں۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ ہم قرآن اور دین اسلام کی ترویج عقلی بنیادوں پر نہیں کر رہے۔ بلکہ عقل کے بجائے مسلکی تعصب، وقتی جذبات اور شخصی سلیقے کی بنیاد پر لوگوں کو دعوت دین دے رہے ہیں، دین کے نام پر شخصی اور گروہی دکانیں چمکا رہے ہیں اور ہمارا سارا دینی، سیاسی واجتماعی نظام شخصیت پرستی کے گرد گھومتا ہے۔

اس کی سب سے بڑی وجہ سے ہماری دینی دعوت اور تبلیغ لوگوں کی عقلوں کو متاثر نہیں کرتی، بلکہ اُن کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے۔ جب جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں تو دینی دعوت کے اثرات بھی ختم ہو جاتے ہیں اور لوگ دوبارہ دنیا پرستی، شہوت طلبی اور اخلاقی پستی کی دوڑ میں لگ جاتے، دوسری طرف جس کو مہمیز دینے والے اسباب بھی ہمارے معاشرے میں سیکولر حکمرانوں کی وجہ سے فراواں ہیں۔

اگر مغرب پرست حکمرانی اور سیاسی نظام کے سامنے استقامت دکھائی جاتی اور عوام کو مسلک وفرقے کے بجائے عقل وخرد کی بنیاد پر دین سے آشنا کرایا جاتا تو آج نہ تو سیاسی نظام میں بے تاج بادشاہتیں قائم ہوتیں اور نہ قصور شہر کے قصبے ''حسین والا'' میں معصوم بچوں کے ساتھ اخلاقی پستی کے مظاہرے ہوتے، نہ ''اگزیگٹ'' جیسے ادارے بنتے اور علم ودانش کی تجارت ہوتی اور نہ قومیت ولسانیت کی بناپر فاشسٹ سیاسی جماعتیں اپنی جڑیں مضبوط کرتیں۔

اخلاقی ودینی اقدار کے علمبردار علمائے دین، دانشوروں، اداروں، مدارس اور جرائد کو چاہیے کہ وہ عقلانیت کی بنیاد پر قرآن وسنت اور سیرت رسول اکرم ﷺ کی ترویج کریں اور انسانوں کی عقل عمومی کو وحی الٰہی اور سیرت نبیؐ کے ذریعے کمال کی طرف لے جائیں۔ خالق کائنات نے ہر انسان کو عقل وخرد کی نعمت سے نوازا ہے۔ جسے شریعت کی زبان میں ''رسول باطنی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی رسول باطنی کی تقویت کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے کرام اور آسمانی کتب اور بے شمار اولیاء واوصیاء بھیجے گئے ہیں۔ اگر ان الٰہی نعمتوں کی قدردانی کی جائے اور ان کی تعلیمات کے ذریعے انسانوں کی عقل وخرد کو صیقل کیا جائے تو یہ کرۂ ارض، بہشتِ ارضی میں بدل جائے۔

لیکن افسوس کے ساتھ ایسا نہیں ہورہا۔ قرآنی آیات، نبویؐ تعلیمات اور اولیائے کرامؒ کی محبت ومودّت کو یا تو اپنے وقتی جذبات کی تسکین کے لئے استعمال کیا جاتا ہے یا ان کے ذریعے اپنی دنیا پرستی کی دکانیں چمکائی جاتی ہیں۔ آج ہمارے معاشرے میں کتنی ہی شخصیات فقط مسلکی ومذہبی عنوان سے اپنا کاروبار زندگی چلا رہی ہیں۔ کوئی روحانیت کے نام پر دکان لگائے بیٹھا ہے، کسی نے استخارے اور تعویذ گنڈے کی چھابڑی لگائی ہوئی ہے، کسی نے دینی سیاست کا کاروبار چمکایا ہوا ہے، کوئی دین کے نام پر جہادی ذبح خانے بناکر معصوم انسانوں کا خون خرابہ کررہا ہے اور کوئی دین کے نام پر تفرقے کے ذریعے اپنی دنیا بنارہا ہے۔ یہ سب آفتیں ہمارے معاشرے کی جڑوں کو کیوں کاٹ رہی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ عقل وخرد سے دوری اور اس ''رسول باطنی'' کی نافرمانی ہے۔

''نور معرفت'' جیسے مجلات اور جرائد اگر دینی تعلیمات کی نشرواشاعت کا فریضہ ادا کرنا چاہتے ہیں تو اس کا عقلی راستہ یہی ہے کہ معاشرے میں عقل کے چراغ روشن رکھے جائیں اور لوگوں کو عقل وخرد کے ذریعے دینی

تعلیمات کی جانب راغب کیا جائے۔ جس کی پائیداری میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ جذبات واحساسات کے ذریعے نہ تو دین کی تبلیغ ہوتی ہے اور نہ پائیدار دینی نظام قائم ہو سکتا ہے۔

نور معرفت کے پانچویں سال کا تیسرا شمارہ پیش خدمت ہے۔ نور معرفت کی ٹیم ہمیشہ کی طرح قرآن اور محمد وآل محمدؐ کی تعلیمات اور معارف کو عقل وخرد کی روشنی میں پیش کرنے کی سعی کر رہی ہے۔اور حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے کہ اس وقیع جریدے میں جذباتی تحریروں اور عقل وخرد سے عاری مطالب سے پرہیز کیا جائے اور مسلکی بنیادوں پر دین کی دعوت نہ دی جائے۔ہم قرآن اور محمد وآل محمدؐ کی تعلیمات کو کس حد تک عقل وخرد کی روشنی میں پیش کرسکے ہیں، اس کا جواب تو ہمارے قارئین ہی دے سکتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے تمام قاری اس حوالے سے ہمارا محاسبہ کرنا اپنا عقلی ودینی فریضہ سمجھیں گے اور ہمیں مثبت وتعمیری تنقید اور آراء سے محروم نہیں کریں گے۔

نور معرفت کے اس شمارے میں پرانے لکھنے والوں کے علاوہ چند نئے اہلِ قلم کے تحقیقی مقالات کا استقبال کیا گیا ہے۔ جسے ہم اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں، کیونکہ ہماری اس حقیر سی کاوش کے نتیجے میں دینی مدارس اور یونیورسٹی سطح کے اہل قلم ومحققین کی علمی وتحقیقی کاوشیں علم دوست حضرات تک پہنچ رہی ہیں۔ اس قلمی تعاون پر ہم اپنے تمام مقالہ نگاروں کے شکر گزار ہیں۔

☆☆☆☆☆

اسلامی ریاست کا تصوراور ضرورت

ڈاکٹر سجاد علی*

sajjad04ali@yahoo.com

کلیدی کلمات: اسلامی ریاست، اسلام، بادشاہت، جمہوریت، الٰہی حکومت۔

خلاصہ

کئی عرصے سے ہمارے دانشوروں اور علما کے مابین اسلامی ریاست، اس کی ضرورت اور اس کی خصوصیات پر تحقیق و بحث جاری ہے۔ اسلامی ریاست کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ جہاں مسلم آبادی زیادہ ہوگی وہی اسلامی ریاست ہے، بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جس مملکت کے قوانین سلطانیہ اسلامی اصولوں کی بنیاد پر بنائے گئے ہوں یعنی قرآن وسنت کو ان قوانین میں مرکزیت حاصل ہو۔ لہٰذا اگر ریاست کی بنیاد سوشلزم، لبرل ازم وغیرہ جیسے نظریات پر رکھی گئی ہو تو ایسی ریاست اسلامی نہیں کہلائے گی نیز چونکہ حکومت ریاست کا ایک عنصر ہے اس لئے جب حکومت اور ریاست مذہب کے تابع ہوں تو اس کو اسلامی ریاست کہا جاسکے گا۔ اس ضمن میں اسلامی طرز حکومت، بادشاہت اور جمہوریت میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ اسلامی طرز حکومت نہ ہی بادشاہت ہے اور نہ ہی مغرب کی رائج کردہ جمہوریت ہے، بلکہ یہ الٰہی حکومت ہے۔ زیر نظر مقالہ میں اسلامی ریاست کے مفہوم اور اس کے دیگر سیاسی نظاموں سے فرق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

*۔ ٹیچنگ، ایسوسی ایٹ شعبہ علوم اسلامی جامعہ کراچی

مقدمہ

یہ ہمیشہ سے موضوع سخن رہا ہے کہ اسلامی ریاست کیا ہے اور اس کی ضرورت کیوں اور کس لئے ہے۔ تاریخ اسلام میں جتنی بھی اسلامی ریاستیں معرض وجود میں آئیں ان ریاستوں کے خدوخال اور کردار کے پیش نظر اسلامی ریاست کی ضرورت کا نظریہ تقریباً ماند پڑ گیا ہے۔ لیکن دوسری طرف آج کی مسلم دنیا میں متعدد ایسی ریاستیں موجود ہیں، جہاں پر ریاست کو مذہب کا تابع بنایا گیا ہے ، یہاں تک کہ چار ریاستوں کے سرکاری نام میں لفظ ''اسلامی'' کا استعمال اسی بات کو ثابت کرتا ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان، اسلامی جمہوریہ ایران، اسلامی جمہوریہ افغانستان، اسلامی ریپبلک آف موریطانیہ۔

قبل اس کے کہ اسلامی ریاست کی ماہیت پر گفتگو کی جائے، اس بات کا تجزیہ لازم ہے کہ کیا اسلام کسی طرح کا نظام زندگی رکھتا ہے؟ یا اسلام محض چند منتشر خیالات اور نظریات کا نام ہے، جس کو اسلام سے وابستہ لوگوں نے اپنی برتری جتانے کے لئے پیش کیا ہے یا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ مسلمانوں نے دیگر نظام ہائے زندگی کا مقابلہ کرنے کی غرض سے چند منتشر نظریات کو منظّم کرکے دنیا کے سامنے پیش کیا ہو؟ یہ میرا محض ایک خیال نہیں ہے، بلکہ بعض مسلمان اور غیر مسلم دانشوروں کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام کے پاس اپنا کوئی سیاسی نظام نہیں ہے بلکہ اسلام محض ایک ایسا مذہب ہے جو انسان کی صرف اخلاقی تربیت کرتا ہے یا ایک فرد کی تربیت اس نہج پر کرتا ہے کہ کمال اور سعادت حاصل کرے۔

اسلام معاشرہ کی فلاح و بہبود اور اس کے ارتقاء کے لئے کوئی منظّم نظام مہیا نہیں کرتا یعنی اسلام سرے سے کوئی سیاسی اور تمدنی نظام تجویز ہی نہیں کرتا۔ انسان کو دنیاوی زندگی استوار کرنے کے لئے خود کوئی سیاسی نظام وضع کرنا ہوگا یا کسی دنیاوی وضع کردہ سیاسی نظام سے خود کو وابسطہ کرنا ہوگا۔ اسی لئے اسلام کے متعلق اس طرح کے فقرے اکثر سامنے آتے ہیں کہ '' اسلام ایک جمہوری نظام ہے۔ اسلام آمریت کا حامی مذہب ہے یا اسلام سوشلزم کا علمبردار ہے''اس طرح کا دعویٰ کرنے والوں نے دین کا باقاعدہ مطالعہ کرکے اس کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے کہ دین کا نظام حیات کیا ہے اور اس میں ریاست کا کیا مقام ہے اور ریاست کو چلانے کے لئے اسلام نے کون سے اصول فراہم کئے ہیں۔ اس طرح کے دعوے کرنے

والوں نے اسلامی نظریہ حیات کے چند ظاہری اصولوں کو دیکھ کر اس پر آمریت، جمہوریت اور سوشلزم ہونے کے الزامات لگائے ہیں۔

اسلامی نظام حیات کو مکمل اور جامع تسلیم نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بنی ہے کہ کچھ اسکالرز نے یہ تصور کیا ہوا ہے کہ جو چیزیں دنیا کے دیگر نظام ہائے زندگی میں مقبول ہیں وہ کسی نہ کسی طرح اسلام میں بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر جب دنیا میں "نظام اشتراکیت" مشہور ہوا تو بعض محققین نے کہا کہ اشتراکیت تو محض اسلام ہی کا ایک نیا ایڈیشن ہے۔ جب بادشاہت کا دور آیا تو اطاعت امیر کا نعرہ بلند ہوا اور اسی طرح آج دنیا میں مختلف نظام ہائے زندگی رائج ہیں، تو بہت سے محققین، اسلام کے نظریۂ حیات کو ان نظام ہائے زندگی سے منسوب کرتے ہیں اور ان میں سے جو جس کو بہتر نظام زندگی تصور کرتا ہے اور ایک کامیاب نظام سمجھتا ہے اسی کو اسلامی نظریہ حیات میں تلاش کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس کی توجیہہ قرآن اور حدیث سے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہماری نظر میں یہ ایک غلط تصور ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ علمی طریقہ سے اس پر تحقیق کی جائے کہ درحقیقت اسلام کا نظریہ نظام حیات کیا ہے؟

اسلام کے نظریہ نظام حیات پر بحث کرنے سے پہلے یہ بتانا لازمی ہے کہ کیا اسلام نے خود بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ اسلام کے پاس ایک مکمل نظام حیات ہے۔ قرآن مجید میں صاف الفاظ میں اعلان ہوا ہے کہ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً۔" (1) (ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) اس آیت میں ایمان والوں سے کہا جا رہا ہے کہ اسلام کو مکمل طور پر اپناؤ۔ اگر اسلام نے فرد کے علاوہ معاشرہ کی تعلیم و تربیت اور اس کو صحیح راہ پر استوار کرنے کا نظام نہ دیا ہوتا تو کبھی وہ فرد کو اپنی پوری زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کو اپنانے کا حکم نہیں دیتا۔ یاد رہے کہ اسلام انسان کو اپنی زندگی کی تمام جہتوں کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام جہاں ایک فرد کو رہنمائی اور ہدایت دیتا ہے کہ وہ سعادت مند ہو جائے وہیں پر وہ معاشرہ کی سعادت مندی کا بھی متمنی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر زاہد علی زاہدی تحریر کرتے ہیں:

"اسلام نہ صرف یہ کہ ایک فرد کی اس نہج پر تربیت کرنا چاہتا ہے کہ وہ کمال اور سعادت حاصل کر سکے، بلکہ اسلام ایک ایسے معاشرہ کی بھی تشکیل چاہتا ہے جس میں افراد معاشرہ کی تربیت کے بھرپور مواقع ہوں اور شر کی قوتوں کو پنپنے کا موقع نہ دیا جائے۔ گویا اسلام خدا اور بندہ کے درمیان روحانی روابط سے آگے بڑھ کر معاشرے کی باگ ڈور بھی ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں دینا چاہتا ہے جو تقویٰ و پرہیزگاری

سے آراستہ ہوں تاکہ ایک عادلانہ معاشرہ کی بنیاد استوار ہوسکے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان مفکرین کے ایک گروہ کے بقول اسلام اپنے نظام حیات کو معاشرے میں نافذ کرنے کے لئے طاقت کے حصول کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔" (2)

لہٰذا سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اسلام محض چند منتشر خیالات اور اصولوں کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل نظام حیات ہے۔ کوئی بھی فرد اور معاشرہ اس وقت تک سعادت مند اور صالح نہیں بن سکتا ہے جب تک انفرادی واجتماعی حیثیت سے اسلام کی مکمل اطاعت نہیں کی جاتی۔

اسلامی نظریۂ حیات کی جامعیت کو کم کرنے کی ایک اہم وجہ دین اور دنیا کی تقسیم بھی بنی۔ بعض قدیم اور جدید مفکرین نے دین کو دنیا سے الگ تصور کیا۔ بنیادی طور پر دین کو دنیا سے الگ تصور کرنا ایک سیکولر فکر ہے۔ سیکولر افراد سیاست کو دین سے الگ اور سیاسی اور ریاستی امور میں دین کی حاکمیت کی نفی کرتے ہیں۔ دنیا کو دینی معاملات سے الگ تصور کرنے کی تاریخ قدیم ہے۔ یہ ہمارے موضوع کا حصہ نہیں ہے کہ اس پر عمیق تحقیق کی جائے البتہ اتنا کہنا کافی ہے کہ کلیسا اور ریاست کی تقسیم کی یہ فکر بنیادی طور پر عیسائیت کی تبلیغات کا حصہ رہی ہے۔ جیسے احمد واعظی رقم طراز ہیں:

"سیکولرازم اور لائیک نے ایک نئی فکری شکل اختیار کرلی اور سیکولرازم نے کائنات اور انسان کو ایک نیا نظریہ دیا۔ یہ نظریہ بہت سے موارد میں دین کی حاکمیت اور اس کی تعلیمات کی قدر و قیمت کا منکر ہے۔ سیکولر حضرات ابتدا میں علم اور ایمان کی علیحدگی پر اصرار کرتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے تمام انسانی علوم حتی کہ فلسفہ اور ماورائے طبیعت موضوعات کو بھی دینی حاکمیت اور دینی تعلیمات کے دائرے سے خارج کر دیا۔ البتہ ان لوگوں کی یہ حرکت اور فکر کلیسا کی سخت گیری کا نتیجہ اور رد عمل تھا کہ جنہوں نے علم و معرفت کو عیسائیوں کی مقدس کتب کی خود ساختہ تفسیروں میں محدود کر دیا تھا اور دانشوروں کی تحقیقات اور علمی رائے کی آزادی کو سلب کر لیا تھا۔ مسیحی کلیساؤں نے قرون وسطیٰ کے تمام علمی، ادبی اور ثقافتی شعبوں میں مقدس کتب پر اپنی اجارہ داری قائم رکھی تھی۔ اس وجہ سے سیکولر حضرات رد عمل کے طور پر "سیکولر علوم اور وہ علوم جو دین اور کلیسا کی دسترس سے خارج تھے" کے دفاع کیلئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔" (3)

کسی بھی قاری کے اس وقت تک اسلام کے نظریہ حیات کی جامعیت کا اندازہ لگانا ممکن نہیں جب تک اسے مذکورہ بالا تقسیم کے بے معنی ہونے کا احساس نہ ہو اور یہ قبول نہ کرے کہ اسلام روح اور نفس کے مجموعہ

کا نام ہے، جب فرد اپنا رابطہ خدا سے باندھے تو اسے روح کہا جاتا ہے اور پھر روح کی پاکیزگی کے لئے اسے اپنے نفس کو دنیا سے معلق کرنا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ خالق کی پہچان مخلوق کے وجود سے ہوتی ہے۔ مخلوق اپنی وجودی حیثیت میں مادّہ ہے اور جوہری حیثیت میں روح۔ انسان من حیث المخلوق مادّہ کا محتاج ہے تو یہ کس طرح سے ممکن ہے کہ روح کی پاکیزگی بغیر مادہ کے ہو جائے۔ لہٰذا خالق کی پہچان کے لئے انسان کو دونوں سے وابستگی لازمی ہے۔ معروف مصری عالم یوسف قرضاوی رقم طراز ہیں:

''اسلام میں سرے سے انسانی زندگی کے معاملات کی یہ تقسیم ہی نہیں کہ زندگی کے یہ امور دینی ہیں اور یہ غیر دینی۔ دین و دنیا کی تقسیم ہی غیر اسلامی اور مسیحی مغرب سے درآمد شدہ ہے اور جو ہمارے معاشرے میں بعض اداروں اور لوگوں کے بارے میں دینی اور غیر دینی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اس تقسیم کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ تاریخ اسلام میں آخری دور تک تقسیم وجود میں نہیں آئی تھی کہ تعلیم کے ایک حصہ کو دینی تعلیم کہا جائے اور اس کے دوسرے حصے کو غیر دینی یا غیر مذہبی کہا جائے۔ کچھ ایسے افراد ہوں جنہیں مذہبی لوگ یا رجال دین کہا جائے اور دوسرے لوگ رجال علم، اہل سیاست اور اہل علم کہلائیں۔ اسلامی نظام حیات میں زندگی کے یہ دو حصے کبھی نہیں رہے اور دین و دنیا کی تفریق کبھی قائم نہیں ہوئی۔ اسلام اس دین سے آشنا نہیں جو سیاست سے عاری ہو اور اس سیاست کو تسلیم نہیں کرتا جو دین سے خالی ہو۔ اسلام میں زندگی کے تمام پہلو اس طرح باہم مربوط اور دوش بدوش رہے ہیں جس طرح جسم و جان کا رشتہ باہم مربوط ہے۔ اسلام کی نظر میں روح کوئی جدا اور علیحدہ شئے ہے اور نہ جسم روح سے بے گانہ ہو کر کوئی حقیقت رکھتا ہے۔ اس لئے اسلام کی نظر میں دین اور علم، دین اور دنیا اور دین اور حکومت کا رشتہ مربوط، غیر منفصل اور کبھی جدا نہ ہونے والا ہے۔'' (4)

اسلام میں مطلقاً ترکِ دنیا کی اجازت نہیں اور نہ ہی تخلیق انسانی کا اصل مقصد صرف دنیا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں دین کی اہمیت کے پیش نظر اکثر دنیا کی مذمت کی گئی ہے، دنیا کی بے ثباتی اور بے وفائی کا تذکرہ اسلامی تعلیمات میں بہت زیادہ ملتا ہے، جس کی وجہ سے طول تاریخ میں مسلمانوں کے درمیان ترکِ دنیا کے نظریات وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے ہیں، آج بھی بعض مسلمان متعدد صوفیاء کرام سے منسوب ترکِ دنیا کی بے شمار عملی صورتیں پیش کرتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی اور عارضی ہونے میں دو رائے نہیں اور نہ ہی دنیا کی بے ثباتی ہونے کا نظریہ اسلامی اصولوں کے خلاف ہے، بلکہ ہمارے نزدیک

لذات دنیا کو ترک کرنے کا نظریہ اسلامی اصولوں کے منافی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور بے وفائی پر حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے تقریباً نو (۹) خطبات (خطبہ نمبر ۳۲، ۵۲، ۶۱، ۶۲، ۸۰، ۸۷، ۹۷، ۱۰۹، ۱۱۱) نہج البلاغہ میں موجود ہیں۔ ان خطبات کو سطحی انداز میں دیکھیں تو یہی تاثر ملتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے مطلقاً ترک دنیا کا درس دیا ہے، لیکن دوسری طرف آپ کے بہت سے ایسے فرامین بھی ملتے ہیں جس میں دنیا اور اس میں موجود ان گنت مظاہر قدرت پر غور کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر اس جملے پر غور کریں ''اَلاَ وَاِنَّ الدُّنْیا دَارٌ لَایُسْلَمُ مِنْھا اِلَّا فیھا'' تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ دنیا ایسا گھر ہے کہ اس کے (عواقب) سے بچاؤ کا ساز و سامان اسی میں رہ کر کیا جاسکتا ہے۔ (5)

لہٰذا کلیسا کے دعویٰ کے مطابق روح کی پاکیزگی کے لئے لذات دنیا سے اپنے کو الگ کرنا ضروری ہے تو دوسری طرف نظریہ سیکولرازم کے مطابق خدا کی پہچان کے لئے ترکِ مذہب لازمی ہے۔ ہماری نظر میں یہ دونوں نظریات فاسد ہیں۔ علامہ اقبال مغربی و مشرقی دونوں علوم پر گہری نظر رکھتے تھے۔ آپ نے مذہب اور دین کی اس تقسیم کو بہت ہی خوب انداز میں یوں پیش کیا ہے:

''اسلام میں روحانی اور وقتی دو الگ الگ عالم موجود ہی نہیں اور کسی بھی فعل کا کردار خواہ غیر مذہبی ہی کیوں نہ ہو، وہ ذہنی رویے کی کارفرمائی ہے، جو صاحب عمل تشکیل دیتا ہے۔ یہ فعل کا نظر نہ آنے والا پس منظر ہے، جو بالآخر اس کو متعین کرتا ہے۔ ایک فعل وقتی (Temporal) یا دینوی (Profane) ہوتا ہے۔ اگر اس کے پیچھے وہ پیچیدگی موجود ہو، اسلام میں وہی ایک حقیقت ہے، جسے اگر ایک رُخ سے دیکھا جائے، تو کلیسا ہے اور اگر دوسرے رُخ سے دیکھا جائے تو ریاست ہے۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ کلیسا اور ریاست ایک شے کے دو پہلو یا اجزا ہیں۔ اسلام ایک واحد حقیقت ہے جو تقسیم نہیں کی جاسکتی ہے۔'' (6)

بہر حال اسلام کے نظریہ حیات کو جامع اور عملی نہ سمجھنے کی ایک بنیادی وجہ یہ بنی کہ اسلام کے نظریات کو دین و دنیا کی ابحاث میں تقسیم کیا گیا اور اسلامی اصولوں کو جو انسان اور معاشرہ کی فلاح اور رہنمائی کے لئے صراط مستقیم کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو ثنویت کا درجہ دے کر انسانیت کو ترکِ دنیا کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف ایک انسانی گروہ کو یہ باور کرایا گیا کہ کامیابی کا راز فقط دنیا ہے۔ اسلام میں ترکِ دنیا کرنے اور اہل دنیا بننے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے صاف الفاظ میں فرمایا ہے۔ '' لا رھبانیۃ فی الدین۔'' دین میں رہبانیت نہیں ہے۔ (7)

ایک طرف اسلام انسان کو اخروی زندگی میں کامیابی کے اسرار و رموز سے آگاہ کرتا ہے تو دوسری طرف ان کا تعلق انسان کی دنیاوی زندگی سے بھی ہے۔ اسلام انسان کی اخروی زندگی کے ساتھ دنیوی زندگی کی کامیابی کا بھی متمنی ہے۔ دنیاوی زندگی میں جب انسان الہ کی الہیت کو تسلیم کرتا ہے تو اس کے ساتھ اسے اللہ کی حاکمیت کو بھی تسلیم کرنا ہوگا۔ کیونکہ انسان خود اپنے وضع کردہ قانون (Self legislation) کو غلطیوں سے مبرا رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس لئے اگر وہ اپنے دنیاوی تقاضوں کے مطابق قوانین بنا بھی لے تو اس کو غلطیوں سے پاک کرنے کے لئے الٰہی ہدایات کا محتاج رہنا پڑے گا۔ انسان کی اپنی فطری آزادی میں کچھ الٰہی قیود و شرائط لگانا خود اس کے اپنے مفاد میں ہے۔ لہٰذا یہ ایک فطری تقاضا ہے کہ انسان ایک صالح اور نیک معاشرہ قائم کرنے کے لئے Divine Laws کا محتاج ہے اور انہی الٰہی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر ایک کامیاب انفرادی و اجتماعی زندگی ممکن ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قوانین الٰہی کا نفاذ حکومت اور ریاست کے بغیر ممکن ہے؟ یہ بات بالکل واضح ہے کہ وعظ و نصیحت کے بغیر معاشرہ کی اصلاح ممکن نہیں، بلکہ اس کو عمل میں لانے کے لئے سیاسی طاقت بھی درکار ہے۔ انبیاء کی اصل ذمہ داری یہی تھی کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں تب ہی تو اللہ نے انبیاء کو حکومت اور طاقت حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ سورہ نور کی آیت نمبر ۵۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا" (8)

ترجمہ: "تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کئے ہیں اللہ تعالیٰ وعدہ فرما چکا ہے کہ انہیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے اور یقیناً ان کے لئے ان کے اس دین کو مضبوطی کے ساتھ محکم کر کے جما دے گا جسے ان کے لئے وہ پسند فرما چکا ہے اور ان کے اس خوف و خطر کو وہ امن و امان سے بدل دے گا۔"

قطع نظر اس بات سے کہ اس آیت کے اصل مصداق کون لوگ ہیں یہ بات واضح ہو جاتی ہیں کہ اہل ایمان اور صالح لوگوں سے اللہ تعالیٰ نے زمین پر حکمرانی، دینی اقتدار اور امن و سکون کا وعدہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء نے اقامت دین، نفاذ شریعت اور حدود اللہ کے اجراء کے لئے حکومت چاہی ہے۔ متعدد انبیاء کی حکومتوں کی طرف اجمالی اشارے اور قرائن خود قرآن مجید بھی موجود ہیں۔ سب سے واضح اور اہم

دلیل خود ریاست مدینہ کی ہے جو میثاق مدینہ کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔ جس میں آپ ﷺ کی بالادستی کو میثاق مدینہ میں شامل تمام قبائل نے قبول کیا تھا۔ ڈاکٹر زاہد علی زاہدی اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں لکھتے ہیں: ''مدینہ میں قائم ہونے والی ریاست کے سربراہ خود رسول اکرم ﷺ تھے اور اس طرح روحانی قیادت اور سیاسی قیادت دونوں ایک شخصیت میں جمع ہو گئی تھی۔'' (9)

لہٰذا انسان کو یقیناً اللہ کی زمین میں اللہ کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے ایک الٰہی حکومت کا قیام لازم ہے اور ان مقاصد کا حصول ریاست کے بغیر ممکن نہیں۔ مسلمان کے لئے خود ریاست اور حکومت کا حصول اصل مقصد نہیں ہے ،بلکہ الٰہی قوانین کی تنفیذ کے لئے ریاست اور حکومت کا ہونا لازم ہے۔

اب ہم گفتگو کرتے ہیں کہ اس ریاست کے خدوخال کیسے ہونا چاہئیں جس کو ایک اسلامی ریاست کہا جاسکے۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ اسلامی ریاست کس کو کہا جائے۔ کیا جس ملک میں مسلمانوں کی اکثریت ہو، اسے اسلامی ریاست کہا جانا چاہئے خواہ اس ملک میں قوانین ملکیہ کچھ بھی ہوں؟ یعنی آبادی کو بنیاد بناتے ہوئے ریاست کو اسلامی قرار دیا جائے۔ یا اس ملک کو اسلامی ریاست کہا جائے کہ جس کی آبادی کی اکثریت بھی مسلمانوں کی ہو اور سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں کے پاس ہو؟ یہ دیکھے بغیر کہ اس سیاسی اقتدار کا دائرہ کار کیا ہے، دین کا ریاستی امور میں کتنا عمل دخل ہے؛ صرف اس بناء پر کہ زمام حکومت مسلمانوں کے پاس ہے کیا اس ملک کو اسلامی ریاست کہا جائے گا؟

آج کی دنیا میں جس مملکت کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہو، اسے اسلامی ریاست سمجھا جاتا ہے۔ ہماری نظر میں اسلامی ریاست کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ جس مملکت کے قوانین سلطانیہ (ملکی قوانین) اسلامی اصولوں کے بنیاد پر بنائے گئے ہوں، یعنی قرآن وسنت کو ان قوانین میں مرکزیت حاصل ہو اور حاکمِ ریاست خود اپنی رعایا کے برابر ان قوانین کا پابند بھی ہو۔ اب اگر کسی ملک میں اکثر آبادی مسلمانوں کی ہو، لیکن اس ریاست کے قوانین ملکیہ کی بنیاد اسلام کے بجائے سیکولرازم، سوشلزم یا کسی اور نظریہ کی بنیاد پر ہو، تو اس ملک کو اسلامی ریاست نہیں کہا جاسکتا۔

آج دنیا میں 53 سے زیادہ ممالک ہیں، جہاں کی اکثر آبادی مسلمانوں کی ہے، کیا ان تمام ممالک کو اسلامی ریاستیں کہا جاسکتا ہے؟ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے بہت سارے ایسے ممالک ہیں، جہاں قوانین سلطنت، سوشلزم اور سیکولرازم وغیرہ کے اصولوں پر موجود ہیں، ترکی اور مقدونیہ جیسے ممالک کی مثالیں

ہمارے دور میں موجود ہیں۔ در حالانکہ وہاں کی اکثریت مسلمانوں کی ہے اور زمام حکومت بھی بظاہر مسلم حکمرانوں کے پاس ہے۔

اس بات کا ذکر کیا جاچکا ہے کہ اسلامی ریاست اس کو کہا جائے جس کے قوانین ملکیہ قرآن و حدیث کے بنیاد پر وضع کئے گئے ہو اور ریاست انسان کے انفرادی اور اجتماعی امور میں ہدایت فراہم کرتی ہو۔ لیکن بد قسمتی سے بیسوی صدی کے بعد بعض مسلمان دانشوروں نے بھی اس نظریہ کی حمایت کی کہ ریاست میں دین کا عمل دخل نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ حکومتی سطح کے معاملات مذہبی وابستگی سے بالاتر رہ کر طے کئے جانے چاہئیں۔

یاد رہے کہ ریاست کی جتنی بھی توجیہات اور تعریفیں کی گئی ہیں جس کے مطابق ریاست کے تین یا چار عناصر ہیں، جن میں سب سے اہم عنصر حکومت ہے، چنانچہ بعض ماہرین نے حکومت ہی کو ریاست کہا ہے۔ پس جس ریاست کے قوانین قرآن و حدیث کی بنیاد پر بنائے گئے ہو اور حکومت اور ریاست کے تمام امور مذہب کے تابع ہوں تو ایسی ریاست کو اسلامی ریاست کہا جائے گا۔ بہر حال حکومت اسلامی کے وجود کے بغیر اسلامی ریاست کا تصور بھی ممکن نہیں۔ دنیا میں جتنی بھی حکومتیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے قائم ہوئی ہیں ان کی بنیادیں ہمیشہ کمزور اور مضمحل رہی ہیں۔ ان میں سے اکثر حکومتیں سیکولر بنیادوں پر قائم ہوئیں تو کچھ مورثی بنیادوں پر، بعض دفعہ اسلامی ریاست کے قیام کی بھی کوششیں نظر آتی ہیں، جن کی بنیاد شورائیت اور اجماع پر رکھی گئی تھی، لیکن یہ بھی بہت جلد اپنی ہیئت اور حقیقت کو قائم نہ رکھ سکیں اور یہ حکومتیں بادشاہت کا روپ اختیار کر گئیں۔

جمہوریت کو بنیاد بناتے ہوئے بھی اسلامی ریاستوں کو قائم کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں، لیکن اس نے بھی مسائل پیدا کئے۔ اس لئے جو لوگ اسلام کی بنیادوں پر ریاست کا قیام چاہتے تھے انہوں نے جمہوریت کے (مغربی) تصور کو اسلام کے لئے خطرناک قرار دیا۔ معروف مستشرق Karen Armstrong (کیرن آرم سٹرانگ) نے ایک کتاب Islam: A Short History لکھی۔ جس کا اردو ترجمہ "مسلمانوں کا سیاسی عروج و زوال" کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کے آخری باب میں مسلمانوں کے ہاتھوں جمہوریت، اجماعیت، بادشاہت، شورائیت اور عقلانیت (سیکولرازم) کے نظریات پر قائم حکومتوں کی ناکامیوں کے اسباب پر بحث کی ہے۔ ان نظریات کی خامیوں اور نقصانات کے تاریخی حوالے بھی پیش کئے ہیں۔

بہر حال مسلمانوں کی ہمیشہ سے یہ کوششیں رہی ہیں کہ ایک ایسی سیاسی جمہوری ریاست قائم ہو، جس میں اسلام کے آفاقی اصولوں کا اجراء ہو اور تمام تر ریاستی امور دین کے بتائے ہوئے اصولوں کے پابند ہوں۔ ماضی میں قائم ہونے والی بعض حکومتوں نے اسلامی اصولوں کا اجراء کرنے کی بھی کوششیں کیں لیکن ان کوششوں کے باوجود ایک مکمل اسلامی فلاحی ریاست کا نمونہ پیش کرنے میں مسلمان ناکام رہے۔ ہماری نظر میں اس ناکامی کی اصل وجہ وہ نظریات تھے، جس کو بنیاد بنا کر وہ حکومتیں اور ریاستیں قائم کی گئی تھیں۔ یہ نظریات اسلامی نظریہ حیات سے مکمل مطابقت اور موافقت نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے یہاں پر ہم ان نظریات کا مختصر جائزہ پیش کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ اسلام کا نظریہ طرز حکومت کیا اور کیسا ہے؟

بادشاہت :

بادشاہت کو ملوکیت سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ دنیا میں رائج شدہ طرز حکومتوں میں ایک بادشاہت ہے۔ جس کی ابتدا اسلام میں رحلت نبوی کے فوراً بعد سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ بقول مولانا مودودی امیر شام کے جبری تخت نشین ہونے کے بعد شروع ہوئی۔ بادشاہت یا اس جیسے تمام تر موروثی حکومتوں کو اسلامی طرز حکومت نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اس طرح کی جتنی حکومتیں قائم رہی ہیں یا اس وقت ہیں، ان کو الٰہی اور اسلامی حکومتیں کہنا دین کو جامع اور کامل ماننے والے محققین کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ اگر کچھ مخصوص افراد حکومت کرنے کو اپنا موروثی حق سمجھتے ہوں، چاہے ریاست میں (ایک محدود پیمانے پر) حدود شریعۃ کا اجراء کیا جاتا ہو تو کیا اس کو بنیاد بناتے ہوئے اس حکومت کو اسلامی حکومت تصور کیا جائے گا؟ بعض بادشاہتوں نے رعایا کو وقتی طور پر مطمئن کرنے کے لئے بعض مذہبی اصولوں کو ملک میں نافذ کیا۔ لیکن دوسری طرف خود کو موروثی طور پر ریاست کا حاکم قرار دیا۔ جبکہ اسلام میں موروثی طور پر حاکمیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ ایسی حکومتوں کو نہ تو اسلامی تائید حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی ان کی حکومت میں عوام کی رائے کا عمل دخل ہوتا ہے۔ موروثی حق حکومت حاصل کرنے والے حکمرانوں نے ہمیشہ سیکولرازم کی تقلید کرتے ہوئے عوام اور رعایا کو یہی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ریاست کے امور میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ ڈاکٹر عسکری کہتے ہیں۔

" شہنشاہت پرست مفکرین جو سیاست میں مذہب کی مداخلت کے خلاف تھے انہوں نے کچھ موہوم سے نظریات پیش کرنا شروع کردیے مثلاً یہ کہ اقتصادیات، قانون، تعلیم اور یہاں تک کہ اخلاقیات اور ثقافت بھی مذہب سے بالکل علیحدہ ہیں۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ مذہب کو اس کی حقیقی شکل میں انسانی زندگی کے انتظامی عنصر سے قطعاً خلط ملط نہیں کرنا چاہیے تاکہ مذہب اپنی پاکیزگی کو برقرار رکھ سکے۔" (10)

بادشاہت نے ریاست کو مذہب سے الگ کرنے کی سیکولر کوششیں اس لیے کیں کہ بادشاہت کے لاقانونی اقدام کی راہ میں صرف اسلامی نظریات رکاوٹ تھے اگر ریاست کی سیاست مذہب کی تابع ہو تو رعایا مذہب کے اصولوں کے مطابق بادشاہت کے طرز حکومت کو قبول نہیں کرے گی، کیونکہ اسلام کسی کو موروثی حق حکومت نہیں دیتا۔ اسلام میں بادشاہت کو حق حکومت نہ دینے کی ایک وجہ بادشاہوں کا ریاست میں مطلق العنان ہو کر حکومت کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہوں کے اکثر فیصلے عوامی مفاد عامہ کے لئے نہیں ہوتے ہیں، بلکہ ذاتی نوعیت کے فیصلے ہوتے ہیں، کیونکہ بادشاہ ایک ایسا مطلق العنّان حاکم ہوتا ہے جو کسی کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ تصور نہیں کرتا۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

Muslim King: The gaze of Muslim Kings was solely fixed on their own dynasic interests and so long as these were prorected, they did not hesitate to sell their countries to the highest bidder](11)

بہرحال یہ بات طے ہے کہ اسلام میں بادشاہت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جس ریاست میں بادشاہی طرز حکومت ہو وہ ریاست قطعی طور پر ایک فلاحی اور اسلامی ریاست نہیں کہلائی گی۔

جمہوریت:

دنیا کی تمام طرح کی طرز حکومتوں میں سے معروف اور مشہور طرز حکومت۔" جمہوریت" ہے۔ جمہوریت جس کو انگریزی میں Democracy کہا جاتا ہے یہ دراصل یونانی لفظ ہے جو دو الفاظ Demo اور Cracy کا مرکب ہے۔ Demo کے معنی عوام اور Cracy کے معنی حکومت کے ہیں۔ جمہوریت کا کوئی ایک یقینی معنی و مفہوم نہیں ہے۔ معروف ماہر لغت لویس معلوف نے جمہوریت کی یوں تعریف کی ہے:

[الجمهوريَّة] الامة او الدولة يعَيّن زعيمها لوقت محدّد لا بالتَّوارثِ بل بانتخاب جمهور الامة (12)

جمہوریت: دراصل رعایا یا ریاست جو اپنے سربراہ کو مخصوص مدت کے لئے اپنا سربراہ متعین کرے اور یہ تعیناتی وراثت کے بنیاد پر نہیں ہو بلکہ ملک کی عوام یہ انتخاب اپنی رائے کے ذریعے کرے۔

دنیا کے سینکڑوں ممالک میں جمہوری حکومتیں موجود ہیں، لیکن سب مختلف النوع جمہوریتیں ہیں۔ جمہوریت ایک مثبت معنی رکھتی ہے، اس لئے مختلف النوع طرز حکومت رکھنے کے باوجود ہر ایک نے اپنے کو جمہوریت کا دعویدار قرار دیا ہے۔ مولانا مودودی جمہوریت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایک شخص بیک نظر ان خصوصیات کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ مغربی طرز کی لادینی جمہوریت Secular Democracy نہیں ہے۔ اس لئے کہ فلسفیانہ نقطہ نظر سے جمہوریت تو نام ہی اس طرز حکومت کا ہے جس میں ملک کے عام باشندوں کو حاکمیت اعلیٰ حاصل ہو۔ ان ہی کی رائے سے قوانین بنے اور صرف انہی ہی کی رائے سے قوانین میں تغیر و تبدل ہو۔ جس قانون کو وہ چاہیں نافذ ہو اور جسے وہ نہ چاہیں وہ کتاب آئین میں سے محو کر دیا جائے۔ یہ بات اسلام میں نہیں ہے۔ یہاں ایک بالا ترین قانون خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول کے ذریعے دیتا ہے، جس کی اطاعت ریاست اور قوم کو کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا اس معنی میں اسے جمہوریت نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے زیادہ صحیح نام ''الٰہی حکومت'' ہے جس کو انگریزی میں Theocracy کہتے ہیں۔'' (13)

جمہوریت کا عمومی مفہوم عوامی حکومت ہے۔ اس لحاظ سے جمہوریت وہ واحد راستہ ہے جس میں ریاست کے اکثر عوام اپنی زندگی کے مختلف شعبوں میں بہترین اور صحیح امور کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اکثریت کا ایک صحیح انتخاب ممکن ہے، لیکن اس کے باوجود جمہوریت یا اکثریت کی رائے کو حتمی طور پر صحیح اور غلط کا معیار نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ ممکنات سے خالی نہیں کہ لوگوں کی منتخب شدہ جماعت عملی طور پر انسان کی فلاح و بہبود کے خلاف کام کریں، جس کی مثالیں دور حاضر کی جمہوری حکومتوں یا تاریخ کی تمام جمہوری حکومتوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں!
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے (14)

بہر حال یہ ماننا ضروری ہے کہ جمہوریت کا جو معنی و مفہوم عرف عام میں سمجھا جاتا ہے، اس جمہوریت کو دینی اور الٰہی حکومت قرار دینا ممکن نہیں ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جمہوریت کا ایک مغربی طرز فکر ہے

اور ایک اسلامی طرز فکر۔ متعدد مفکرین نے جمہوریت کی ان دونوں اقسام کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کرن آرم اسٹرانگ نے مغربی جمہوریت کی تعریف یوں کی ہے:

''عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام کے لئے'' (15)

اسلامی جمہوری طرز حکومت اور مغربی جمہوری طرز حکومت میں بہت فرق ہے۔ مغربی جمہوریت کے مقابلے میں اسلامی جمہوری حکومت کو ہم یوں بیان کر سکتے ہیں ''خدا کی حکومت، خدا کے ذریعے، عوام کے لئے'' اور اسی صورت میں جمہوریت کی موافقت اسلامی حکومت سے ممکن ہے۔ لیکن اگر جمہوریت کا وہ مفہوم جس میں مملکت کے قوانین کی بنیاد قرآن و سنت پر نہیں اور طرز حکومت وہ نہیں جو اسلام تقاضا کرتا ہے تو پھر ایسی مملکت اور اس کی حکومت کو الٰہی یا دینی حکومت صرف اس بنیاد پر قرار دینا کہ زمام حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، صحیح نہیں ہے۔ حضرت روح اللہ خمینیؒ نے بادشاہ ایران کی دو ہزار سالہ پرانی بادشاہت کا خاتمہ اسی لئے کیا تھا کہ بادشاہ ایران عملی طور پر اسلامی قوانین کی روح کا خاتمہ کر چکا تھا اور نام نہاد لبرل جمہوریت کے نام سے حکومت کر رہا تھا۔ امام خمینیؒ کا اصل ہدف بادشاہت کا خاتمہ نہیں تھا بلکہ نام نہاد لبرل جمہوریت کا خاتمہ کرنا تھا جو اسلامی قوانین کی تنفیذ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی اور اس کے بدلے میں ایک اسلامی جمہوریت کا قیام تھا۔ امام خمینیؒ نے مدرسہ فیضیہ میں انقلاب اسلامی کے قیام کے بعد اپنی ایک تقریر میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی تھی:

''میں نے شروع ہی سے پکارا کہ ہم ان دو لفظوں کو چاہتے ہیں یعنی ''اسلامی جمہوریت'' اگر آپ دیکھ لیں کہ اسلام کا لفظ چھوڑا گیا اور صرف جمہوری کہا تو جان لیجئے کہ ان کا راستہ آپ کے راستے سے الگ ہے۔ اگر آپ دیکھ لیں کہ اس میں ایک بھی لفظ کا اضافہ ہوا تو جان لیجئے کہ یہ دھوکہ ہے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ آپ کو اسلام کے خلاف راستے پر لے چلیں۔ اگرچہ وہ شہنشاہی حکومت کے خلاف بھی ہوں، بلکہ ان میں بہت سارے برخلاف بھی ہیں۔ لیکن ہمار مقصد صرف یہ نہ تھا کہ شہنشاہی حکومت ختم ہو جائے اور بس۔ وہ تو صرف ابتدائی مرحلہ تھا۔ چونکہ وہ حکومت اس بات میں رکاوٹ ڈالتی تھی کہ اسلامی احکام نافذ ہوں اور قرآن پر عمل پیرا ہو جائے۔ اس لیے ہم نے اس کی مخالفت کی۔۔۔۔ ہمارا دشمن صرف بھاگا ہوا شاہ نہیں تھا بلکہ جس کسی کا راستہ اسلام کا راستہ نہ ہوگا وہ ہمارا دشمن ہے چاہے وہ کسی بھی نام سے پکارا جاتا ہو۔ جو کوئی جمہوریت چاہتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے کیونکہ وہ اسلام کا دشمن ہے۔ جو بھی کوئی ڈیموکریٹک جمہوریت کا

نعرہ بلند کرے وہ ہمارا دشمن ہے کیونکہ وہ اسلام کو نہیں چاہتا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا ان لوگوں نے شہادت کو ڈیموکریسی یا دائیں بازو کے راستے کے لئے سعادت سمجھا، یا اسلامی جمہوریت کے لئے؟ کیا ہمارے نوجوانوں نے اپنا خون اس لیے بہایا کہ وہ اس طرح کی جمہوریت قائم کریں جس طرح کی روس یا امریکہ میں ہے؟ نہیں ہر گز نہیں بلکہ ہم سب نے یہ سب کچھ کیا، صرف جمہوریت کے لئے۔" (16)

حضرت امام خمینیؒ نے واشگاف الفاظ میں یہ واضح کیا کہ ان کی جدوجہد کا واحد مقصد اسلامی جمہوری حکومت کا قیام تھا، جس میں خدا کا قانون، خدا کے تائید کردہ بندوں کے ذریعے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے نافذ ہو اور اسی کو وہ اسلامی جمہوری حکومت کہتے ہیں، جس کے لیے دینی اور الٰہی حکومت کی اصطلاحیں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ امام خمینیؒ کی اس الٰہی فکر کو "ولایۃ الفقیہ" کا نام دیا جاتا ہے۔

جمہوریت اور الٰہی حکومت میں اس لئے بھی بہت زیادہ فرق ہے کہ موجودہ جمہوریت جس معنی اور اور مفہوم میں سمجھی جاتی ہے وہ دراصل لبرالزم کا دوسرا نام ہے۔ یہی وہ وجہ ہے کہ دور حاضر میں بھی مغربی ممالک مسلمانوں کو اپنے ملکوں میں جمہوری حکومتوں کے قیام پر زور دیتے ہیں۔ کیونکہ استعمار یہ سمجھتا ہے کہ جمہوریت کے لبادہ میں اس کی اپنی منشاء کے مطابق لبرالزم نظریات موجود ہیں۔ امریکی صدر بش نے جب مشرق وسطیٰ کا دورہ کیا تو انہوں نے اپنے اس دورے کے دوران مصر کے شہر حرم الشیخ میں پاکستانی ہم منصب سید یوسف رضا گیلانی کے ساتھ ایک پریس بریفنگ سے خطاب کیا، جس میں انہوں نے مسلمان کو اپنے ممالک میں جمہوریت لانے پر زور دیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صدر بش مسلمانوں کو کونسی جمہوریت قائم کرنے کو کہہ رہے ہیں؟ صدر بش تو عوامی رائے پر قائم ہونے والی جمہورتوں کا صرف اس لئے انکار کرتے ہیں کہ یہ حکومتیں امریکہ نواز نہیں ہیں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ مسلمان ممالک میں اسلامی طرز فکر کی جمہوری حکومتیں قائم کرنے کا حامی ہو۔ اس حوالے سے فلسطین کے گزشتہ انتخابات ہمارے پیش نظر ہیں۔ حضرت امام خمینیؒ نے اسی لئے تو فرمایا تھا کہ "جو کوئی جمہوریت چاہتا ہے وہ ہمارا دشمن ہے کیونکہ وہ اسلام کا دشمن ہے۔ جو بھی کوئی ڈیموکریٹک جمہوریت کا نعرہ بلند کرے وہ ہمارا دشمن ہے کیونکہ وہ اسلام کو نہیں چاہتا" (17) امام خمینی نے مغربی جمہوریت کی بڑی شدّت کے ساتھ مخالفت اسی لئے کی تھی کہ مغربی جمہوریت لبرالزم کا دوسرا نام ہے۔ جبکہ اسلامی نظریہ حیات میں انسان محکوم اور بندہ قرار پاتا ہے۔ احمد واعظی نے اپنی کتاب "اسلامی نظریہ حکومت" (جس کا اردو ترجمہ معارف

اسلامی پبلشرز، قم نے کیا ہے) میں جمہوری طرز حکومت پر تفصیلی جائزہ لیا ہے، جس میں جمہوریت اور دینی حکومت میں موافقت اور عدم موافقت پر بحث کی ہے۔ زیادہ تفصیل کے لئے اس کتاب کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

جمہوری طرز فکر کے مطابق اگر کسی ریاست میں حکومت قائم ہوتی ہے تو وہ صرف عوام کی رائے کے مطابق قائم ہوگی، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کو یا عوام کے منتخب نمائندوں کو کس حد تک حق حکومت حاصل ہے؟ کیا عوام کے منتخب نمائندوں کو حاکمیت حاصل ہے؟ مولانا مودودی نے اپنی کتاب میں اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ آپ سوالیہ انداز میں اس کا جواب یوں دیتے ہیں؛

Political Sovereignty کس کے پاس ہے؟ اس کا لامحالہ جواب یہی ہے کہ وہ بھی اللہ کی ہے۔ پھر کسی خاص طبقہ کا نہیں بلکہ عوام کے پاس ہے اس فرق کے ساتھ کہ مغربی جمہوریت میں جمہور کو حاکمیت کا حامل قرار دیا جاتا ہے اور ہم مسلمان جسے جمہوریت کہتے ہیں اس میں جمہور صرف خلافت کے حامل ٹھہرتے ہیں۔ (18)

شورائیت:

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خلافت کا تعین کس طرح سے ہوگا، کیا خلافت کا تعین شوریٰ اور اجماع کے ذریعے صحیح ہے؟ اگر خلافت کا تعین شوریٰ اور اجماع سے قائم کیا جائے تو یہ بھی دراصل عوامی انتخاب ہوگا تو اس صورت میں حاکمیت اعلیٰ کا حق عوام کو حاصل ہوگا اس صورت میں لبرل جمہوریت اور اس جمہوریت میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ جمہوریت چاہے اجماع، شوریٰ یا کوئی اور طریقہ سے قائم ہو اسلامی نظریہ حاکمیت کے عین مطابق نہیں ہے کیونکہ اس سے جمہور ہی کو حاکمیت حاصل ہو جاتی ہے، جبکہ اسلامی نظریہ حیات کے مطابق حاکمیت اعلیٰ کا حق صرف خالق کائنات کو حاصل ہے۔ اس کے بعد اللہ کے نمائندے انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہے اور پھر رسول کے تعین کردہ نمائندوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خود حاکمیت اعلیٰ کا حق اپنے پاس رکھیں یا اپنے نمائندوں کو یہ حق تفویض کریں۔ یوں حاکمیت اعلیٰ کا انتخاب خود خالق کی طرف سے ہونا ممکن ہے۔ عوام اللہ کی قائم کردہ حاکمیت اعلیٰ کے زیر تسلط اپنی جمہوری روش کے ذریعے زندگی کے مختلف شعبوں میں منافع اور مصالح کے لئے عوامی نمائندوں کو منتخب

کر سکتے ہیں، اگر جمہوریت کو اس معنی اور مفہوم میں لیا جائے تو اس جمہوریت کی گنجائش ممکن ہے۔ یاد رہے کہ اس جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں فرق صاف واضح ہوگا کہ جسے مولانا مودودی نے مغربی جمہوریت کی تشریح میں کہا ہے کہ مغربی جمہوریت میں جمہور کو حاکمیت حاصل ہے، لیکن اسلامی جمہورت میں حاکمیت اللہ کو حاصل ہے تو اس کی اصل اور عملی شکل یہی ہو سکتی ہے۔ مولانا مودودی ایک اور جگہ اسی طریقہ کار کو قابل عمل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''اسلامی ریاست کیوں؟ قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے۔ خلق اس کی ہے لہٰذا فطرتاً امر کا حق Right of Rule بھی صرف اس کو پہنچتا ہے۔ اس کے ملک Dominion میں اس کی خلق پر خود اس کے سواء کسی دوسرے کا امر جاری ہونا اور حکم چلنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ صحیح راستہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ اس کے خلیفہ اور نائب کی حیثیت میں اس کے قانون شرعی کے مطابق حکمرانی ہو اور فیصلے کئے جائیں، (سورہ آل عمران کی ایت نمبر ۲۶ میں اس طرف اشارہ ہے) اس اصل الاصل کی بنا پر قانون سازی کا حق انسان سے سلب کیا گیا، کیونکہ انسان مخلوق اور رعیت ہے۔ بندہ اور محکوم ہے اس کا کام صرف اس قانون کی پیروی کرنا ہے جو مالک الملک نے بنایا ہے۔ البتہ قانون الٰہی کی حدود کے اندر استنباط اور اجتہاد سے تفصیلی فقہ مرتب کرنے کا معاملہ دوسرا ہے۔ خداوند عالم کی زمین پر صحیح حکومت اور عدالت صرف وہ ہے جو اس قانون کی بناء پر قائم ہو جو اس نے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجا ہے اس کا نام خلافت ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ حکومت اور عدالت باغیانہ ہے جو خداوند عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے قانون کے بجائے کسی دوسری بنیاد پر قائم ہو۔ حقیقی مالک الملک نے جب انہیں سلطان (Chater) عطا ہی نہیں کیا تو وہ جائز حکومتیں اور عدالتیں کس طرح ہو سکتی ہیں۔ وہ تو جو کچھ کرتی ہیں خدا کے قانون کی رو سے سب کا سب کالعدم ہے۔'' (19)

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ لبرل جمہوریت کی گنجائش اسلام میں نہیں ہے البتہ مقید جمہوریت کی گنجائش اسلام میں ہے اسی کو شیعہ ''نظریہ ولایت'' کہتے ہیں اور اس کی عملی شکل حکومت ایران ہے، جس میں عوامی رائے بھی شامل ہے، لیکن حاکمیت اعلیٰ کا انتخاب عوام کے پاس نہیں ہے۔ اس نظریہ کی تفصیل سمجھنے کے لیے احمد واعظی کی کتاب ''اسلامی نظریہ حکومت'' کو دیکھا جاسکتا ہے۔

مسلمان اکثریت کے ساتھ یہی رائے رکھتے ہیں کہ خلیفہ کا انتخاب اور روش حکومت کی بنیاد شوریٰ پر قائم ہے۔ معروف مصری عالم ڈاکٹر یوسف قرضاوی شوریٰ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بلاشبہ اسلام نے شوریٰ کی مفصل شکل بیان نہیں کی، لیکن اس کا ذکر مکی قرآن میں ہے جو فرد اور معاشرے کے لئے اس کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ مکی قرآن نے شوریٰ کو اسلامی زندگی کے عناصر میں سے ایک عنصر بنادیا ہے اور قیام صلوٰۃ اور اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے متعلق حکم کے ساتھ بیان کرکے اسے اسلامی معاشرے کی لازمی خصوصیت قرار دیا ہے۔" (20)

یہ بات قطعی ہے کہ انسانی نظام زندگی میں شوریٰ کو اولیت حاصل ہے، لیکن خلیفہ کے انتخاب میں شوریٰ کا کوئی کردار اسلام میں نہیں ہے۔ قرآن مجید نے کہیں خلیفہ کے انتخاب کے اصول میں شوریٰ کو معیار نہیں قرار دیا، جن آیات میں شوریٰ کی اہمیت پیش کی جاتی ہیں ان آیات کا مصداق انتخاب خلیفہ نہیں ہے بلکہ معاملات زندگی ہے۔ سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۳۸ اور سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۵۹ میں معاملات میں مشورہ کے لئے حکم دیا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے ان آیات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حاکم کا انتخاب شورائیت کے ذریعے سے ہونا لازم قرار دیا ہے، توکچھ مفسرین نے ان آیات کے ذریعے حاکم کو راہ سمجھانے کا معیار شوریٰ کو قرار دیا ہے۔ تاریخ میں خلیفہ کے انتخاب کے معیار کی ایک ہی مثال حضرت عمر کی حیات میں ملتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

"حضرت عمرؓ نے چھ اصحاب شوریٰ کو مقرر کرکے اکثریتی اصول کو اختیار فرمالیا تھا، یہاں تک کہ اگر تین ایک رائے اختیار کرلیں اور باقی تین دوسری جانب ہوجائیں تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ (آپ کا اپنا فرزند) جس رائے کے حامی ہوں اسے ترجیح حاصل ہوجائے اور اگر فریقین اس پر رضامند نہ ہوں تو ان تین کی رائے کو ترجیح دی جائے جن میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف موجود ہوں۔" (21)

قطع نظر اس کے کہ اس شورائیت کا سیاق و سباق کیا ہے۔ لیکن اس میں حضرت عمرؓ کی طرف سے اپنے فرزند اور عبدالرحمٰن بن عوف کو حق انتخاب دینا خود یہ بتارہا ہے کہ انتخاب خلیفہ کا معیار شوریٰت نہیں ہے۔ کیونکہ اس فیصلے میں اصل مرجع حضرت عمرؓ قرار پاتے ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب نے بھی اس موقع میں اپنی مرجعیت کے دلائل پیش کئے تھے۔ دیکھیں نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۷۳۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی اصل ماہیت یہ ہے کہ جس ملک کے قوانین کی بنیاد قرآن و حدیث پر ہو اور زمام حکومت اللہ کے منتخب شدہ بندوں کے پاس ہو اور وہ ان قوانین کو مطلقاً ملک میں نافذ کرتے ہوں، یعنی خدا کے قوانین خدا کے ذریعے خدا کی مخلوق کے لئے۔ جس ملک کی اکثر آبادی مسلمانوں کے پاس ہو اور زمام حکومت بھی مسلمانوں کے پاس ہو، لیکن اس حکومت کی بنیاد جمہوریت، بادشاہت، شورائیت، یا کسی بھی طرز کی ہو تو اس ملک کو اسلامی ریاست نہیں کہا جائے گا۔ اسلامی ریاست صرف اس مملکت کو کہا جاسکتا ہے جس میں قائم حکومت مذہب کی تابع ہو اور حاکمیت اعلیٰ کا حق اللہ اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کو حاصل ہو جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے۔

''تمہارے سرپرست اور رہبر صرف خدا، اس کا پیغمبر اور وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ انہوں نے نماز قائم کی ہے اور حالت رکوع میں زکوٰۃ ادا کی ہے''۔(22)

اس ریاست کے معاملات اور فیصلوں میں عوامی شرکت بھی ہو، ریاست عوامی رائے کا احترام کرے، جیسا کہ پیغمبر خدا ﷺ کو حکم ہوا کہ ''اور کاموں میں ان سے مشورہ کیا کرو''(23) جبکہ آپ ﷺ اللہ کی طرف سے مطلقاً حق ولایت رکھتے تھے، لیکن پھر بھی آپ ﷺ کو حکم ملا کہ ریاست کے امور میں عوام کی شرکت کے لیے اہتمام کیا جائے تاکہ عوام اپنے منافع اور مصالح کا انتخاب خود کر سکیں۔ اسی پس منظر میں کسی بھی ملک میں حکومت قائم ہو تو اس ملک کو اسلامی ریاست کہا جاسکتا ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔ سورہ بقرہ، آیت نمبر ۲۰۸

2۔ زاہدی، ڈاکٹر زاہد علی، حکومت اسلامی کا فکری تجزیہ بحوالہ ولایت فقیہ، پی ایچ ڈی مقالہ باب اول، ص ۷، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

3۔ واعظی، احمد، اسلامی نظریہ حکومت، معارف اسلام پبلشرز، سنہ اشاعت ۱۴۲۶ھ ق، ص ۵۲، قم، ایران

4۔ قرضاوی، ڈاکٹر یوسف، اسلام اور سیکولرازم، مطبع ادارہ تحقیقات اسلامی، سن طباعت 1997ء، ص ۵۳، اسلام آباد

5۔ رضی، علامہ شریف، نہج البلاغہ، مترجم مولانا مفتی جعفر حسین، ناشر امامیہ کتب خانہ مغل پورہ، خطبہ نمبر ۶۱، لاہور

6۔ محمد، علامہ اقبال، مترجم شہزاد احمد، اسلامی فکر کی نئی تشکیل، مکتبہ خلیل یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ، ص ۱۸۵، ۱۸۴، اردو بازار، لاہور، پاکستان

7۔ امام ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب، مشکوٰۃ الشریف، عبداللہ اکیڈمی، سن اشاعت ۲۰۳، حدیث نمبر ۳۱۶، لاہور

8۔ سورہ نور، آیت نمبر ۵۵

9۔ زاہدی، ڈاکٹر زاہد علی، حکومت اسلامی کا فکری تجزیہ بحوالہ ولایت فقیہ، پی ایچ ڈی مقالہ باب اول، ص ۱۲

10۔ حسین عسکری، پروفیسر ڈاکٹر مرزا، انقلابِ ایران کے اثرات، ص ۲۷۸،

11۔ جعفری، سید محمد حسین، اقبال فکر اسلامی کی تشکیل جدید، پاکستان اسٹڈی سنٹر، ص ۷۷، جامعہ کراچی

12۔ المنجد، للمطبعۃ الکاثولیکیۃ، ۱۹۵۲ء، ص ۹۹، بیروت۔

13۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، اسلامک پبلی کیشنز (پرائیوٹ) لمیٹیڈ،، ص ۱۳۹، جون 1995 ، لوئر مال روڈ لاہور۔

14۔ محمد، علامہ اقبال، ضرب کلیم، الفیصل ناشران وتاجران کتب اردو بازار، جون 1991ء، ص ۱۲۶، لاہور

15۔ کرن آرمسٹرانگ، مسلمانوں کا سیاسی عروج وزوال، محمد احسن بٹ، ناشر نگارشات پبلشرز، 2005ء، ص ۱۷۶، مزنگ روڈ، لاہور

16۔ پروفیسر ڈاکٹر مرزا عسکری حسین، انقلابِ ایران کے اثرات، بحوالہ امام خمینی، انقلاب کی راہ عمل، اردو ترجمہ انتشارات کتاب خانہ اسلامی، ص ۱۸

17۔پروفیسر ڈاکٹر مرزا عسکری حسین، انقلابِ ایران کے اثرات، بحوالہ امام خمینی، انقلاب کی راہ عمل، اردو ترجمہ انتشارات کتاب خانہ اسلامی، ص۱۸

18۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، ص ۳۴۲،

19۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، ص۵۲۔۶۰،

20۔قرضاوی، ڈاکٹر یوسف، اسلام اور سیکولرازم، مطبع ادارہ تحقیقات اسلامی، سن طباعت 1997ء، ص۱۴۰،اسلام آباد

21۔قرضاوی، ڈاکٹر یوسف، اسلام اور سیکولرازم، مطبع ادارہ تحقیقات اسلامی، سن طباعت 1997ء، ص۱۴۲-۱۴۱،اسلام آباد

22۔سورہ مائدہ،آیت نمبر ۵۵

23۔سورہ آل عمران،آیت نمبر ۱۵۸

علامہ اقبال کی احیائے اجتہاد کی کوششیں

گل واحد*

nadeemgulwahid@gmail.com

کلیدی کلمات: اجتہاد، اسلامی قانون، اسلام کی نشاۃ ثانیہ، حرکت وارتقاء

خلاصہ

فقہ اسلامی میں کسی قانونی مسئلے کی آزادانہ رائے قائم کرکے اس مسئلے کا حل تلاش کرنا اجتہاد ہے۔ اجتہاد کو اسلام کے قانونی نظام میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا علمانے اس کی کچھ شرائط بھی ذکر کی ہیں۔ البتہ اجتہاد کے معنی کسی قانونی مسئلے پر اظہار رائے کے ہیں نہ کہ اسلامی قانون کو بدل دینے کے ہیں۔ اس رائے کے قیام کی اجازت صرف مجتہدینِ دین کو ہے۔ عظیم مفکر ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اُنہوں نے نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے سامنے جدید مسائل کے حل میں رہنمائی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تشکیل جدید کے لئے اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ عالم اسلام گذشتہ پانچ صدیوں سے اصول حرکت وارتقاء کو نظرانداز کرنے کی وجہ سے جمود کا شکار ہیں۔ اسے اجتہاد ی فکر کی بحالی کی اشد ضرورت ہے تاکہ زندگی میں تازگی برقرار رہے اور فکر و نظر ہر دم تازہ اور متحرک رہے۔ اس مقالے میں اسی موضوع کے متعلق مختلف دانشوروں کی آراء کی روشنی میں علامہ اقبال کے نظریہ اجتہاد کا جائزہ لیا گیا ہے۔

*۔ ریسرچ اسکالر، شعبہ علوم اسلامی جامعہ کراچی

مقدمہ

اجتہاد کے لغوی معنی جدوجہد اور کوشش کرنے کے ہیں۔ فقہ اسلامی کی رو سے کسی قانونی مسئلے کی آزادانہ رائے قائم کرکے اس مسئلے کا حل تلاش کرنا اجتہاد ہے۔ حدیثِ معاذ بن جبل أجتهد رأی ولا آلو جهداً (1) اس کی ایک مثال ہے۔ یعنی پیش آمدہ معاملات میں جب قرآن وسنت سے کوئی واضح رہنمائی نہ ملتی ہو تو اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ ہر فرد خود سے کسی مسئلے کی تلاش میں مجتہد بن جائے، بلکہ وہ شخص جو مجتہد کی صفات رکھتا ہو وہی اجتہاد کر سکتا ہے جس کے باعث اجتہاد کو اسلام کے قانونی نظام میں بہت اہمیت حاصل ہے جو قرآن وسنت کے بعد تیسرا بنیادی ماخذ ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

"علما کے کلام سے اجتہاد کی جو حقیقت سمجھی گئی وہ یہ ہے کہ شریعت کے فروعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے سمجھنے کیلئے مقدور بھر کوشش کرنا اجتہاد ہے۔" (2)

یعنی کسی مسئلہ پر علماء کا دلائل شریعہ کی روشنی میں حل تلاش کرنے کیلئے "حکم" کا تعین کرنا اجتہاد ہے اور عمل کرنے والا مجتہد ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"اجتہاد کے لغوی معنی تو انتہائی کوشش کرنے کے ہیں لیکن شرعی اصطلاح میں اس انتہائی کوشش کو کہتے ہیں جو کتاب وسنت کے اشارات و مضمرات سے کوئی حکم معلوم کرنے کیلئے کی جاتی ہے۔" (3)

یعنی مجتہد مسئلے کے حل کیلئے انتہائی کوشش اور لگن سے حکم کی تلاش کرے گا۔ مگر ایسا بھی نہیں ہوگا کہ وہ قرآن وسنت سے بالکل بے نیاز ہو کر اپنی مرضی سے جو حکم تلاش کرے وہ حکم اجتہاد بن جائے گا بلکہ وہ قرآن وسنت نبوی کی روشنی میں حکم تلاش کرے گا اور جو حکم قائم کرے وہ اس وقت تک "رائے" کی حیثیت سے قائم ہوگا جب تک اس رائے پر اجماع نہ قائم ہو۔ مولانا امین احسن اصلاحی اجتہاد کیلئے کتب فقہ کی رو سے تین شرائط کا ذکر کرتے ہیں:

1) ایک یہ کہ اجتہاد کا اہل وہ شخص ہے جس کو کتاب وسنت پر پورا پورا عبور حاصل ہو۔

2) دوسری یہ کہ وہ پیش آمدہ حالات و مسائل کی تہ تک پہنچنے والا ہو اور ان کے مالہ و ما علیہ کو اچھی طرح سمجھنے والا ہو۔

3) تیسری یہ کہ وہ اپنے اخلاق و سیرت کے لحاظ سے ایک قابل اعتماد آدمی ہو تاکہ لوگ اپنے دین کے معاملہ میں اس پر اعتماد کر سکیں۔(4)

مولانا مزید تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اجتہادی مسائل میں سے صرف وہی مسئلہ رائے کے درجے سے بالاتر ہو جاتا ہے جس پر مجتہدین امت کا اجماع ہو جائے۔ اجماع اجتہاد کی سب سے اعلیٰ قسم ہے۔ کسی اجتہاد پر اجماع ہو جانے کے بعد اس کی حیثیت صرف ایک رائے کی نہیں رہ جاتی بلکہ وہ شریعت کے نصوص کی طرح ایک حجت شرعی بن جاتا ہے جس کی مخالفت کسی مسلمان کیلئے جائز نہیں۔'' (5)

درجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاشرے کو پیش آمدہ کسی مسئلہ کے حل اور وضاحت کیلئے سب سے پہلے اللہ کی کتاب قرآن مجید کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اگر قرآن مجید میں واضح بات نہ ملے تو پھر رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کے طور طریقے سے ہدایت کی طرف رجوع کرنا ہے اگر رسول اللہ ﷺ کی سنت میں بھی مسئلے کا واضح حل موجود نہ ہو تو پھر اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔ قرآن و سنت کے اشارات، خلفائے راشدین کے تعامل، صحابہ کرام کی سیرت اور قانون اسلام کے مزاج کو سامنے رکھ کر مسئلے کے حل کا تعین ''اجتہاد'' ہوگا۔ اجتہاد کے معنی کسی قانونی مسئلے پر اظہار رائے کے ہیں نہ کہ اسلامی قانون کو بدل دینے کے ہیں۔ اس رائے کے قیام کی اجازت صرف مجتہدین دین کو ہے نہ کہ ہر شخص مجرد اپنی عقل کی رہنمائی پا کر اظہار رائے کا حق رکھتا ہے۔

اجتہاد اسلامی نظام قانون میں وہ ادارہ ہے جو اسلامی نظام قانون کو از سر نو تدوین کے ذریعہ Up Date رکھتا ہے۔ کیونکہ امت مسلمہ کو ہر دور کے نئے مسائل اور حالات سے نبرد آزما ہونے کیلئے اس کی شدید ضرورت رہی ہے۔ یہی وہ طریقہ کار ہے جو مشکل سے مشکل الجھن کو آسان بنا کر اسلامی نظام قانون کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق رواں دواں رکھتا ہے۔ اجتہاد کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر محمد عثمان اجتہاد کو تین اقسام میں تقسیم کرتے ہیں۔ اول اجتہاد مطلق، دوم اجتہاد مقید اور سوم اجتہاد فیہ۔

اجتہاد مطلق

جب کوئی امام، فقیہ یا مجتہد مکمل آزادی کے ساتھ بغیر کسی دوسرے امام و فقیہ کے اپنی پوری بصیرت کی رہنمائی حاصل کرتا ہے تو اس اجتہاد کو اجتہاد مطلق کہتے ہیں اور اسے امام و فقیہ کو مجتہد مطلق کہتے ہیں۔ مثلاً امام شافعی، امام مالک، امام ابو حنیفہ اور امام احمد بن حنبل۔

اجتہاد مقید:

اس اجتہاد میں کوئی عالم دین کسی امام و فقیہ کا مقلد یا پابند ہوتے ہوئے کوئی کام انجام دیتا ہے، اسے مجتہد مقید کہا جاتا ہے۔

اجتہاد فیہ:

جب کسی امام و فقیہ نے کسی مسئلے کو کھلا چھوڑا ہو اور اس کے بارے میں حتمی رائے نہ دی ہو تو اس امام و فقیہ کا کوئی ماننے والا اپنے فہم و فراست کے بارے میں اس مسئلے کا حل پیش کرے۔ (6)

نئے حالات نئے مسائل کو جنم دیتے ہیں اور نئے مسائل ہمیشہ اپنی ضرورت محسوس کراتے ہیں اس لئے انفرادی اور قومی زندگی بلکہ بین الاقوامی زندگی کے پس منظر میں مسلمانوں کو ہر صدی میں اس کا جائزہ لینے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔

دور جدید کے اسلامی اسکالرز میں ڈاکٹر علامہ محمد اقبال نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ علامہ اقبال نے نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے سامنے نت نئے مسائل کے حل میں رہنمائی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تشکیل جدید کیلئے اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ جس کیلئے ۱۹۲۸ء میں ان کے خطبات مدراس میں خصوصی طور پر چھٹا خطبہ ''اسلام کی ساخت میں حرکت کا اصول'' یا ''الاجتہاد فی الاسلام'' ان کی فکر کو واضح کرتا ہے۔ بقول پروفیسر محمد عثمان کے، اقبال کے ہاں پانچ بڑے اجتہاد روشن و تابندہ دکھائی دیتے ہیں۔

۱۔ اسلامی تصور قوم کی نئے معیاروں پر توضیح و توجیہ

۲۔ مغربی تہذیب کے بارے میں متوازن و مخصوص موقف

۳۔ کارل مارکس، کمیونزم اور انقلاب روس کیلئے منفرد زاویہ نگاہ

۴۔اسلام کے سماجی و ثقافتی اصولوں کی بازیافت اور کارفرمائی پر زور

۵۔اسلام اور سوشل ڈیموکریسی واشتراکی جمہوریت میں موافقت وہم آہنگی کی دریافت۔ (7)

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے مگر انسانی معاشروں کے احوالِ زندگی افراد کے درمیان تقویٰ کے فقدان، اخلاق فاضلہ کی سرایت، تمدن انسانی کی ترقی وارتقاء، جدید معاملات سے سابقہ پیش آنا ان تمام تر مسائل کیلئے نئے طریقہ کار کی ضرورت پڑتی ہے اس لئے شرعی احکامات میں معاشرے کے جدید تقاضوں کے مطابق اجتہاد کی ضرورت مسلمہ حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے۔

علامہ اقبال کا خیال ہے کہ عالم اسلام گذشتہ پانچ صدیوں سے اصول حرکت وارتقاء کو نظرانداز کرنے کی وجہ سے جمود کا شکار ہیں۔اسے اجتہادی فکر کی بحالی کی اشد ضرورت ہے تاکہ زندگی میں تازگی برقرار رہے اور فکر و نظر ہر دم تازہ اور متحرک رہے۔

عروج آدم خاکی زتازہ کاری ہاست　　مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

اقبال اجتہاد کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے بھی تقلید سے انکار نہیں کرتے بلکہ تقلید کے راستے میں حرکت وارتقاء کے تمام راستوں کی مسدودیت کے باعث اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ اپنے خطبے ''قومی زندگی'' ۱۹۰۴ء میں لکھتے ہیں:

''قرآن شریف اور احادیث کے وسیع اصول کی بناء پر جو استدلال فقہاء نے وقتاً فوقتاً کئے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کیلئے واقعی مناسب اور قابل عمل تھے مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں ہیں.....اگر موجودہ حالات زندگی پر غور وفکر کیا جائے تو جس طرح ہمیں اس وقت تائید اصولی مذہب کیلئے ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے اسی طرح قانون اسلامی کی جدید تر تفسیر کیلئے ایک بہت بڑے فقیہ کی ضرورت ہے جس کے قوائے عقلیہ ومتخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلمات کی بناء پر قانون اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب و منظم کرسکے بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔'' (8)

اسی ضرورت کے پیش نظر اقبال نے برصغیر اور عالم عرب میں شخصیات تلاش کرنے کی جستجو کی۔ گو کہ ان کو ناسازی طبیعت اور پھر موت نے زیادہ وقت نہ دیا۔ مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

"وہ جوانی کے زمانے میں محسوس کر چکے تھے اگر اسلام کو ایک ضابطہ حیات کی حیثیت سے آج کل کے زمانے میں کامیاب اور آبرومند بنانا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ زمانہ حال کے Jurisprudence یعنی اصول قانون کی روشنی میں شرع اسلامی کے اساسیات دنیا کے سامنے پیش کئے جائیں اور دلیل و برہان، اصول فقہ اسلامی کی برتری آج کل کے زمانے پر ثابت کی جائے۔ مجوزہ کتاب کا نام تھا Reconstruction of Muslim Jurisprudence ۔" (9)

مولانا عبدالمجید سالک ذکر اقبال میں کہتے ہیں:

"انہوں نے بار بار یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ ایک کتاب لکھیں گے جس کا نام Islam as I understand یعنی اسلام میرے نقطے نظر سے جس میں اسلام پر ایک جدید تعلیم یافتہ سائنسدان اور فلسفی کے زوایئے نگاہ سے روشنی ڈالی جائے گی اور ایسی زبان اختیار کی جائے گا جسے زمانہ حال کے علمی حلقے سمجھتے ہیں۔" (10)

علامہ نے اس کتاب "اصول فقہ کی تدوین جدید" کے بارے میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام ایک خط میں لکھا:

"میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈینس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، اسلام کا مجدد اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔" (11)

ایک اور جگہ کہا:

"موجودہ دور میں اسلام کی سب سے بڑی فقہ کی تدوین جدید ضروری ہے تاکہ زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح حل پیش کیا جائے جن کو دنیائے موجودہ کے قومی اور بین الاقوامی سیاسی، معاشی اور سماجی ارتقاء نے پیدا کر دیا ہے۔" (12)

علامہ کی خواہش تھی کہ ایک ایسا علمی مرکز قائم کیا جائے جہاں سے اہل علم اسلام کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق پیش کریں اور دنیا کے مسلمہ اصولوں کے مطابق دین الٰہی کی حقانیت ثابت کریں۔ مولانا عبدالمجید سالک لکھتے ہیں:

"مدت دراز سے علامہ کے دماغ میں یہ تجویز گردش کر رہی تھی کہ ایک علمی مرکز قائم کیا جائے جہاں دینی اور دنیاوی علوم کے ماہرین جمع کئے جائیں اور خورد و نوش کی فکر سے بالکل

آزاد کر دیئے جائیں تاکہ وہ ایک گوشے میں بیٹھ کر علامہ کے نصب العین کے مطابق اسلام، تاریخ اسلام، تمدن اسلام، ثقافت اسلام، اور شرع اسلام کے متعلق ایسی کتابیں لکھیں جو آج کل کی دنیا کے فکر میں انقلاب پیدا کر دیں۔" (13)

علامہ اقبال نے اس غرض کی تکمیل کیلئے علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا انور کشمیری، ابوالکلام آزاد، مولانا عبیداللہ سندھی، عبداللہ یوسف علی، علامہ محمد اسد جیسے مشاہیر سے بھی رابطہ قائم کیا تھا۔

مذکورہ مقاصد اور منصوبوں کی تکمیل کیلئے علامہ برصغیر کے اہل علم کو پنجاب منتقل ہونے پر آمادہ کرتے رہے۔ ۱۹۱۶ء میں اورینٹل کالج لاہور ہیڈ پریشین ٹیچر کی اسامی خالی ہوئی تو اس کیلئے علامہ سید سلیمان مرحوم کو لکھا:

"مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ ملازمت کو قبول نہ کریں گے لیکن سینڈیکٹ کے بعض ممبروں کی تعمیل ارشاد میں آپ کو لکھنا ضروری تھا کہ کسی قدر خود غرضی کا شائبہ بھی میرے خط میں نہ تھا اور وہ یہ کہ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح پنجاب والوں کو صوبہ متحدہ کے علماء و فصحاء سے اس سے بیشتر فائدہ پہنچا ہے اب بھی وہ سلسلہ آپ کے یہاں رہنے سے جاری رہے گا۔" (14)

۱۹۲۹ء میں دارالعلوم دیوبند کے مولانا سید انور شاہ کشمیری (م ۱۹۳۳ء) کو بھی علامہ نے کوشش کی کہ وہ لاہور آجائیں مگر آپ کی دعوت سے قبل وہ ڈابھیل چلے گئے۔

اگست ۱۹۳۷ء کو شیخ الازہر علامہ مصطفیٰ مراغی کے نام خط میں آپ اپنے مستقبل کے پلان کو بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"..... لہٰذا میری تمنا ہے کہ آپ ازراہ عنایت ایک روشن خیال مصری عالم کو جامعہ الازہر کے خرچ پر ہمارے پاس بھیج کر ممنون فرمائیں تاکہ یہ شخص ہم کو اس کام میں مدد دے چاہیے کہ یہ شخص علوم شرعیہ، تاریخ و تمدن اسلامی میں ماہر ہو نیز زبانِ انگریزی میں بھی قدرت رکھتا ہو۔" (15)

جامعہ الازہر سے کوئی عالم نہ آسکا اندرون ملک علمائے دین اپنے اپنے علمی مراکز سے کٹ کر آنا نہ چاہتے تھے۔ کسی کو زمانے سے شکوہ تھا، اور کوئی اپنے مرکز سے محبت رکھتا تھا۔ آخر کار علامہ کی نگاہ سید مودودی پر پڑی۔ سید مودودی کے قلم کا شہرہ ہو چکا تھا۔ جمعیت علمائے ہند کے ترجمان روزنامہ الجمعیت

دہلی کے مدیر کی حیثیت سے ان کا ایک مقام تھا پھر اسی دور میں ۱۹۲۶ء میں سید مودودی نے اسلام کے تصور جہاد کو "الجہاد فی الاسلام" کی صورت میں پیش کیا۔

علامہ اقبال کو نظریہ جہاد سے دلچسپی تھی اور وہ اہل قلم کو خاص طور پر ہندوستان میں مسئلہ جہاد کی تاریخ لکھنے پر ابھارتے رہے۔ علامہ کو سید مودودی کی تالیف "الجہاد فی السلام" پسند آئی۔ علامہ کہا کرتے تھے:

"اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے معذرت خواہ لہجہ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ جنگ اور جہاد کے متعلق اسلام کے جو نظریات ہیں انہیں کسی تاویل و تعبیر کے بغیر بڑے کروفر سے پیش کیا۔" (16)

چوہدری نیاز علی مرحوم جو سابق اسسٹنٹ انجینئر محکمہ انہار پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور جو علامہ اقبال کے ذاتی دوست تھے انہوں نے علامہ کی اس خواہش کو پورا کرنے کیلئے ۷۰ ایکڑ زمین پٹھان کوٹ میں علمی درسگاہ کیلئے وقف کردی تھی۔ جس کا نام دارالاسلام رکھا گیا تھا۔ سید نذیر نیازی لکھتے ہیں:

"علامہ نے چوہدری نیازی علی مرحوم سے دارالاسلام کے مردکار کے بارے میں کہا کہ حیدرآباد سے ترجمان القرآن کے نام سے بڑا اچھا رسالہ نکل رہا ہے۔ مودودی صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں میں نے ان کے مضامین پڑھے ہیں دین کے ساتھ ساتھ وہ مسائل حاضرہ پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کی کتاب الجہاد فی الاسلام مجھے بہت پسند آئی ہے۔ آپ کیوں نہ انہیں دارالاسلام آنے کی دعوت دیں۔ میرا خیال ہے وہ دعوت قبول کرلیں گے۔" (17)

سید مودودی حیدرآباد دکن میں رہ کر اپنی تحریک اور مقصد کو آگے بڑھانا چاہتے تھے جس کیلئے انہوں نے زمین بھی حاصل کرلی تھی۔ ابتدا میں علامہ کی پیشکش کو قبول نہ کرسکے مگر بہت جلد حالات و واقعات کا ادراک کرتے ہوئے پنجاب منتقل ہونے کا ارادہ کیا۔ سید مودودی لکھتے ہیں:

"میں پنجاب سے دلچسپی نہ رکھتا تھا، بلکہ یہاں کی صحافت اور سیاست اور مناظرہ بازیوں کا رنگ دیکھ کر دور ہی سے اتنا بدگمان تھا کہ پنجاب آنا پسند بھی نہ کرتا تھا۔ مگر ۱۹۳۶ء کے آواخر میں پہلی مرتبہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مجھے توجہ دلائی کہ میں دکن کو چھوڑ کر پنجاب میں قیام کروں۔ پہلی نگاہ میں تو مجھے اس تجویز نے کچھ زیادہ متاثر نہ کیا مگر جب ۱۹۳۷ء کے آواخر میں، میں نے دکن چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور کسی دوسرے مستقر کی تلاش میں حیدرآباد سے نکلا تو مرحوم سے

مشورہ کرنے کیلئے لاہور حاضر ہوا۔ اور یہاں بالمشافہ گفتگو کرنے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا کہ آئندہ میرے لئے پنجاب ہی میں قیام کرنا زیادہ مناسب ہے۔" (18)

پروفیسر کرار حسین علامہ کی فکر اجتہاد سے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہیں:

"اب اجتہاد میں صورت یہ ہے کہ بنیادی اصول و اقدار تو قائم اور ثابت ہیں لیکن زمانہ بدلتا رہے گا۔ اور یہ تاریخ کی حرکت (Dynamic) ہے اس میں زمانہ بدلتا رہے گا۔ پیداواری رشتے اور طریقے بدلیں گے معاشی و معاشرتی روابط تبدیل ہوں گے، حکومت کے طریقے سوسائٹی کی ہیئتیں (Forms) بدلیں گے تو ان بدلتی ہوئی حالتوں پر نہ بدلنے والی اقدار کا اطلاق کس طرح کیا جائے یہ اصل میں اجتہاد کا مسئلہ ہے دراصل اقبال نے اجتہاد کے معنوں کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہونے لگا جسے ہر انسان کی فکر اجتہاد ہے اور ہر شخص اجتہاد کر سکتا ہے۔" (19)

پروفیسر کرار حسین کہتے ہیں کہ اجتہاد سے متعلق اقبال کی فکر میں دو بڑے اہم موضوعات نظر آتے ہیں وہ اپنے مقالے میں کہتے ہیں:

"گویا اجتہاد پر ان کا اس قدر زور دینا پھر یہ کہنا کہ خلیفہ فرد کی بجائے جماعت بھی ہو سکتی ہے اس کے ساتھ ہی ترکی کی مثال کو سامنے رکھ کر یہ کہنا کہ سیاست کے تقاضوں کو دین کے تقاضوں سے جدا بھی کیا جا سکتا ہے اس طرح ان کی فکر میں دو بڑے اور اہم موضوعات نظر آتے ہیں ایک تو وہ ہے جو دین اور (علما مغرب بھی دین کے متعلق خصوصی غور و فکر کرتے ہیں) فلسفہ مذہب سے متعلق ہے اور دوسرا وہ جو معاشرے سے متعلق ہے۔" (20)

ڈاکٹر رشید احمد جالندھری اپنے مقالہ "اسلامی قانون کے ارتقاء میں اجتہاد کا کردار" میں مصری عالم ڈاکٹر احمد امین کے حوالے سے مسلم دنیا کے فکری انحطاط پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تقریباً پانچ سو سال مسلمانوں نے فکری میدان میں جو کچھ لکھنا ہے اگر اسے غرق دریا کر دیا جائے تو اس سے علم و ادب کو کوئی زیادہ نقصان اٹھانا نہیں پڑے گا۔" (21)

آگے ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ مسلم مفکرین نے اس دعویٰ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے وہ لکھتے ہیں کہ شیخ جمال الدین افغانی نے کہا تھا:

''یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بن ہو چکا ہے چہ معنی دارد؟ قرآن و سنت کی کس نص سے دروازہ بند کیا گیا ہے اور کس امام نے یہ کہا ہے کہ میرے بعد مسلمانوں کو دین کی بصیرت و ادراک حاصل کرنا مناسب نہیں ہے یا انہیں قرآن مجید اور احادیث صحیح سے ہدایت حاصل کرنی نہیں چاہیے۔ یا ان کے مفہوم و مراد کی گہرائی میں اترنے اور اسے وسعت دینے کیلئے سعی و نشاط سے کام لینا نہیں چاہیے۔'' (22)

پروفیسر وارث میر اپنے مقالے ''عصر حاضر کے تقاضے اقبال اور اجتہاد میں اقبال کے خطبہ ''اسلامی ثقافت کی روح'' کا حوالہ دیتے ہوئے زمانہ حال کے ''جورس پروڈنس'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے بہ اعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی سے ہر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔'' (23)

اقبال امت مسلمہ کے مسائل کے حل میں اجتہادی فکر کو صدیوں قبل کھینچے گئے تن دائرے کو توڑنا چاہتے ہیں مگر ساتھ ساتھ آپ کو احتیاط اور اعتدال کے دائروں میں اسلام کے بنیادی تصورات کو پیش کرنے کی پابندی کا خود اظہار کرتے ہیں چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

''بہر حال ہم اس تحریک کا جو حریت اور آزادی کے نام پر عالم اسلام میں پھیل رہی ہے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آزاد خیالی کی یہی تحریک، اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ و انتشار کی طرف ہوتا ہے۔ پھر اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ ہمارے مذہبی اور سیاسی رہنماء حریت اور آزادی کے جوش میں بشرطیکہ اس پر کوئی روک عائد نہ کی گئی ہو اصلاح کی جائز حدود سے تجاوز نہ کر جائیں۔'' (24)

اقبال کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ جدید علوم کے حصول کے بغیر عظمت رفتہ کا آنا ناممکن ہے کیونکہ دنیا کی اقوام نت نئے ایجادات اور دنیا کی قیادت وسیادت کے زعم میں تیز تر گامزن ہونے کی وجہ سے بے علم اور بے نظم و ضبط اقوام کی دنیا میں کوئی حقیقت تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے اور جدید دور میں جدید مسائل کے حل کی ایک ہی صورت نظر آتی تھی کہ امت مسلمہ اپنی نشاۃ ثانیہ کیلئے اسلاف کے کام میں

جدت کے ساتھ ساتھ نت نئے مسائل کا حل زمانے کے سامنے پیش کرے۔اقبال ۱۹۳۷ء میں فضل کریم کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

"ذاتی طور پر میں پسند کروں گا کہ ہمارے نوجوان مسلم اسکالرز ریاضیات، فزکس، کیمسٹری اور جورس پروڈنس کے مطالعہ پر اپنی توجہ مرتکز کریں ان دنوں اسلام کے بہترین مفاد میں ہے کہ علم کی ان ہی شاخوں کا مطالعہ کیا جائے یہی ایک چیز ہے جو مسلمانوں کو جدید علم کی جڑوں سے روشناس کرائے گی اور انہیں اس قابل بنائے گی کہ جدید دور کے مسائل کو سمجھ سکیں۔" (25)

اقبال اپنی فکر میں جس جدید "جورس پروڈنس" کے احیاء کی تعلیم پر زور دیتے ہیں اور فی زمانہ اس کی ضرورت پر زور دیتے ہیں وہاں امام ابو حنیفہ کی شخصیت اور ان کے کام کے متعلق پوری بصیرت رکھتے ہوئے امام ابو حنیفہ کی فکر سے متاثر نظر آتے ہیں مگر ایسا بھی نہیں کہ علامہ ماضی کے بے جا احترام پر اپنے عہد کے تقاضوں کو قربان کردیں بلکہ امام ابو حنیفہ کی فکر تلے اپنی جدید سوچ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں اقبال اپنی فکر کو ان الفاظ کا روپ دیتے ہیں:

"اگر قوم کے زوال کو روکنا ہے تو اس کا یہ طریقہ نہیں کہ ہم اپنی گذشتہ تاریخ کو بے جا احترام کی نظر سے دیکھنے لگیں یا اس کا احیاء خود ساختہ ذرائع سے کریں... ماضی کا غلط احترام اور اس طرح ضرورت سے زیادہ جماعتی نظم اور جمود کا رجحان اسلام کی اندورنی روح کے خلاف ہے۔ جیسے جیسے مسلمانوں میں زندگی کو تقویت پہنچے گی اسلام کی عالم گیر روح فقہاء کی قدامت پسندی کے باوجود اپنا کام کرتی رہے گی۔ بد قسمتی سے اس ملک کے قدامت پسند عوام کو ابھی یہ گوارہ نہیں کہ فقہ اسلامی کی بحث میں کوئی تنقیدی نقطہ نگاہ اختیار کیا جائے وہ بات بات پر خفا ہو جاتے ہیں اور ذرا سی تحریک پر بھی فرقہ وارانہ نزعات کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔" (26)

پھر اقبال ائمہ مذاہب کے استدلال اور تعبیرات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"کیا ائمہ مذاہب کا یہی دعویٰ تھا کہ ان کا استدلال اور ان کی تعبیرات حرف آخر ہیں..... عہد حاضر کے مسلمان کبھی یہ گوارہ نہیں کریں گے کہ اپنی آزادی ذہن کو خود اپنے ہاتھوں قربان کردیں۔ اگر ہمارے افکار میں وسعت اور وقت نظر موجود ہے اور ہم نئے نئے تجربات سے فائدہ بھی اٹھا رہے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ فقہ اسلامی کی تشکیل نو میں جرأت سے کام لیں لیکن یہ کام

محض اس زمانے کے احوال و ظروف سے مطابقت پیدا کرنے کا نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم یورپ کی جنگ عظیم نے ..... بیداری کی لہر دوڑادی ہے۔" (27)

"پس اقبال کے نزدیک یہ جو شوکت کی تحصیل ہے وہ اسی ذریعے سے ممکن ہے کہ مسلمانوں کے دینی احیاء کے ساتھ ساتھ ان کے تمدن کا احیاء بھی وجود میں لایا جائے اور تمدن سے مراد .....علوم اسلامیہ کا تعلق علوم جدیدہ سے پیدا کرنا ہے تاکہ آپ سائنس اور ٹیکنالوجی کی طرف رجوع کریں اور اسی طریقے سے شوکت حاصل ہو سکتی ہے اور جب شوکت آپ کو حاصل ہو گی تو دنیا میں مسلم معاشرہ وجود میں آجائے گا۔" (28)

اقبال کی نظر میں اسلام میں عبادات میں کوئی تغیر و تبدیل ممکن نہیں مگر معاملات تغیر کے اصولوں کے پابند ہیں اس لئے معاملات کو وقت کے تقاضوں یا قوم کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اقبال اس تبدیلی کا حق اسلامی ریاست میں اسمبلی کو دیتے ہیں جسے وہ اجماع کا نام دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر جاوید اقبال کے یہ اسمبلی یا مجلس شوریٰ تین اہم میدانوں میں قانون سازی کے فرائض انجام دے سکتی ہے۔

۱۔ رائج الوقت قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنا۔

۲۔ ایسے اسلامی قوانین نافذ کرنا جو اب تک نافذ نہیں کئے گئے۔

۳۔ ایسی قانون سازی کرنا جو قرآن وسنت سے متصادم نہ ہو۔

اقبال اجتہاد کا اختیار علماء سے لے کر قانون ساز اسمبلی کو دینا چاہتے ہیں وہ قانون شریعت کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا نظریہ یوں پیش کرتے ہیں کہ:

"In view of the instance conservation of the Mulism of India, Judges cannot but stick to what are called standard works. The result is that which the peoples are moving, the Law reaming stationary."(29)

اقبال اجتہاد کو اسلام کے تمدن، ثقافت اور مذہبی نظام میں اصول حرکت سمجھتے ہیں جن پر پوری زندگی کا دارومدار ہے ان کے نزدیک اسلامی ثقافت کی ترقی میں بنیادی طور پر کردار اصول اجتہاد یا حرکت ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ اقبال کے ہاں حرکت اور اجتہاد مترادف اصول یا اصطلاحیں ہیں۔ اجتہاد ہی وہ ذریعہ ہے جس سے

فقہی مسائل زمانے کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق حل کیے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال قانون شریعت کی روح کو زندہ کرنے کیلئے چاروں ماخذ شریعت کا تفصیلی ذکر کرتے ہیں۔ اقبال لکھتے ہیں:

"چونکہ زمانہ بدل چکا ہے اور دنیائے اسلام ان نئی نئی قوتوں سے متاثر اور دوچار ہو رہی ہے جو فکر انسانی کی ہر سمت میں غیر معمولی نشوونما کے باعث پھیل رہی ہے۔ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مذاہب فقہ کی خاتمیت پر اصرار کرتے رہنا چاہیے کیا ائمہ مذاہب نے کبھی بھی یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان کے استدلال اور تعبیرات حرف آخر ہیں؟ ہر گز نہیں تو پھر اگر مسلمانوں کا آزاد خیال طبقہ اس امر کا دعوے دار ہے کہ اسے اپنے تجربات اور زندگی کے بدلتے ہوئے احوال و ظروف کے پیش نظر فقہ و قانون کے بنیادی اصولوں کی از سر نو تعبیر کا حق پہنچتا ہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو غلط ہو۔ قرآن پاک کا یہ ارشاد ہے کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے بجائے خود اس امر کا مقتضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے، نہ یہ کہ اسے اپنے لئے روک تھام تصور کرے۔" (30)

اقبال اجتہاد کی ضرورت پر مزید کہتے ہیں:

"لہٰذا یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے محض ایک افسانہ ہے جس کا خیال کچھ تو اس لئے پیدا ہوا کہ اسلامی افکار فقہ ایک متعین صورت اختیار کرتے چلے گئے اور کچھ اس ذہنی تساہل کے باعث کہ روحانی زوال کی حالت میں لوگ اپنے اکابر مفکرین کو بتوں کی طرح پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اگر فقہائے متاخرین میں سے بعض نے اس افسانے کی حمایت کی ہے تب بھی عہد حاضر کے مسلمان کبھی یہ گوارہ نہیں کریں گے کہ اپنی آزادی ذہن کو خود اپنے ہاتھوں قربان کر دیں۔

دسویں صدی ہجری میں زرکشی نے اس موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے نہایت ٹھیک لکھا ہے کہ اس افسانے کے حامی اگر یہ سمجھتے ہیں کہ متقدمین کو اس امر میں زیادہ آسانیاں حاصل تھیں، برعکس اس کے متاخرین کا راستہ مشکلات سے پر ہے تو یہ بڑی غیر معقول بات ہوگی یہ اس لئے کہ فقہائے متاخرین کو اجتہاد کیلئے زیادہ آسانیاں حاصل ہیں۔ قرآن مجید اور سنت رسول میں تفاسیر و شروح کا ذخیرہ اس حد تک وسیع ہو چکا ہے کہ آج کل کے مجتہدین کے پاس بہ نسبت سابق تعبیر و ترجمانی کا کہیں زیادہ سامان موجود ہے۔" (31)

علامہ اقبال کا کہنا یہ ہے کہ اسلامی قوانین خواہ کتنے ہی ہمہ گیر ہوں، ضرورت کے مطابق اجتہاد کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ اپنے خطبہ ''الاجتہاد فی الاسلام'' میں لکھتے ہیں:

''اس ساری جامعیت اور ہمہ گیری کے باوجود ہمارے نظامات فقہ باآخر افراد ہی کی ذاتی تعبیرات کا نتیجہ ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان پر قانون نشوونما کا خاتمہ ہوچکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علمائے اسلام نے مذاہب فقہ کے بارے میں کچھ ایسے رائے قائم کر رکھی ہے جس کے باوجود انہوں نے اجتہاد کی ضرورت سے بھی اصولاً کبھی انکار نہیں کیا ہے۔'' (32)

علامہ اقبال سمجھتے ہیں کہ مختلف علوم کے ارتقاء، معاشروں کی وسعت مسالک اور فرقوں کی بہتات کے باعث اجتہادی کام کسی ایک یا دو افراد کی دسترس میں نہیں رہا چنانچہ عصر حاضر میں اجتماعی اجتہاد کے ذریعے سے اطمینان کی تمام تر کیفیت کو حاصل کیا جاسکتا جس کی ممکنہ صورت پارلیمانی اجتہاد ہے مگر پارلیمان سے مراد صالح، متقی، صاحب علم و بصیرت، قابل اعتماد و ثقہ اور ہر طرح کے علوم کے ماہرین پر مشتمل معاشرہ کے صلاحیت اور صالحیت کے چیدہ چیدہ لوگوں کو نمائندگی حاصل ہو نہ کہ غیر معتبر غیر صالح، مادر پدر آزاد سیکولر سوچ و فکر کے تحت منتخب ہوئی ہو۔ علامہ اقبال کا اجتہادِ نو کی ضرورت پر زور دینا جس پر فقہاء امت کا اجماع کہ تغیر زمان سے تغیر احکام لازم آتے ہیں۔

علامہ کی اس اجتہادی فکر پر ناقدین نے یہاں تک کہا کہ مسلمات فقہ اسلامی سے انحراف اور فقہاء امت کے نقطہ نظر کے خلاف ایک انوکھی اور نئی فکر قرار دی گئی۔ علامہ اس کا جواب سید سلیمان ندوی کے نام پر ایک خط میں دیتے ہیں:

''زمانہ حال کے جورسپروڈنس Jurisprodence کی روشنی میں اسلامی معاملات (مسائل متعلقہ) کو مطالعہ کیا جائے۔ مگر غلامانہ انداز میں نہیں بلکہ ناقدانہ انداز میں یونان کا فلسفہ ایک زمانے میں انسانی علوم کی انتہاء تصور کیا گیا مگر جب مسلمانوں میں تنقید کا مادہ پیدا ہوا تو انہوں اسی فلسفے کے ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ کیا اس عمر میں ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔'' (33)

افکار اقبال امت مسلمہ کے بحیثیت مجموعی صدیوں کی غلامی، محکومی اور علمی و عملی جمود و انحطاط کا تریاق اجتہاد میں سمجھتے ہیں وہ تقلید کو غلامی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال سمجھتے ہیں کہ قرآن پاک کی موجودگی، رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات ہی دراصل دین و شریعت کی روح ہے اس لئے فکری و عملی جمود کے خاتمہ کی

صورت تعلیمات نبوی ﷺ کی طرف پلٹنا مذہبی قیادت کی اصلاح جب تک مربوط ہو کر امت کی رہنمائی کیلئے ایک فلسفہ حیات جس میں ترقی پسند اور تغیر پذیر فطری کردار کی طرف نہیں پلٹیں گے اُمت مسلمہ ذہنی و فکری، علمی و عملی جمود و انحطاط سے تعمیر و ترقی اور عروج کی جانب گامزن نہیں ہو سکتی۔

*****

حوالہ جات

1۔ سنن ابی داؤد، کتاب الاقضیہ ، باب اجتہاد الرائی فی القضاء، مکتبہ رحمانیہ، سن ۲۰۰۵، لاہور

2۔شاہ ولی اللہ دہلوی، عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، ۱۹۹۵، ص ۲۰، دار الفتح الشارقۃ، الامارات العربیۃ المتحدۃ،

3۔امین احسن اصلاحی، جدید ریاست میں قانون سازی اور مسائل دار التذکیر، ص: ۵۵، ۲۰۰۵، لاہور

4۔امین احسن اصلاحی، جدید ریاست میں قانون سازی اور مسائل دار التذکیر، ص: ۵۸، ۲۰۰۵، لاہور

5۔امین احسن اصلاحی، جدید ریاست میں قانون سازی اور مسائل دار التذکیر، ص: ۶۹، ۲۰۰۵، لاہور

6۔پروفیسر محمد عثمان، مقالہ: ''سرمایہ اجتہاد میں اقبال کا حصہ'' مشمولہ اقبال فکر اسلامی کی تشکیل جدید''، پاکستان اسٹڈی سینٹر، ۲۰۰۸ء، ص ۲۸۵، جامعہ کراچی

7۔پروفیسر محمد عثمان، مقالہ: ''سرمایہ اجتہاد میں اقبال کا حصہ'' مشمولہ اقبال فکر اسلامی کی تشکیل جدید''، پاکستان اسٹڈی سینٹر، ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۸، جامعہ کراچی

8۔عبدلواحد معینی، مقالاتِ اقبال، القمر پبلشر، ۲۰۰۱ء، ص: ۹۱، لاہور

9۔عبدالمجید سالک، فکر اقبال، بزم اقبال، ۱۹۵۵، ص ۲۱۱۔ ۲۱۲، لاہور

10۔عبدالمجید سالک، فکر اقبال، بزم اقبال، ۱۹۵۵، ص ۱۰، لاہور

11۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، شیخ محمد اشرف، ۱۹۵۱، ج اوّل، ص ۵۰۔۵۱، لاہور

12۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، شیخ محمد اشرف، ۱۹۵۱، ج اوّل، ص ۵۰۔۵۱، لاہور

13۔عبدالمجید سالک، فکر اقبال، بزم اقبال، ۱۹۵۵، ص ۲۱۱۔ ۲۱۲، لاہور

14۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، شیخ محمد اشرف، ۱۹۵۱، ج اول، ص ۷۶، لاہور

15۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، شیخ محمد اشرف، ۱۹۵۱، ج اول، ص ۲۴۹-۲۵۰، لاہور

16۔ہفتہ روز چٹان، شمارہ ۲۵اپریل ۱۹۵۴ء ،لاہور

17۔ہفتہ روز ایشیاء، ۱۷اپریل ۱۹۶۹ء ،ص ۱۶، لاہور

18۔سالنامہ ،چراغ راہ، ۱۹۶۰، ص ۳۷، کراچی

19۔پروفیسر کرار حسین، مقالہ: ''عصری تقاضے اور خطبات اقبال'' مشمولہ اقبال فکر اسلامی کی تشکیل جدید''، پاکستان اسٹڈی سینٹر، ۲۰۰۸ء، ص ۳۱۴۔۳۱۵، جامعہ کراچی

20۔ایضاً

21۔ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، مقالہ: ''اسلامی قانون کے ارتقاء میں اجتہاد کا کردار''، مشمولہ اقبال فکر اسلامی کی تشکیل جدید، پاکستان اسٹڈی سینٹر، ۲۰۰۸، ص: ۱۳، جامعہ کراچی

22۔ڈاکٹر رشید احمد جالندھری، مقالہ: ''اسلامی قانون کے ارتقاء میں اجتہاد کا کردار''، مشمولہ اقبال فکر اسلامی کی تشکیل جدید، پاکستان اسٹڈی سینٹر، ۲۰۰۸، ص: ۱۳، جامعہ کراچی

23۔پروفیسر وارث میر، مقالہ: ''عصر حاضر کے تقاضے اقبال اور اجتہاد''، مشمولہ اقبال فکر اسلامی کی تشکیل جدید، پاکستان اسٹڈی سینٹر،، ۲۰۰۸، ص: ۱۳۳، جامعہ کراچی

24۔پروفیسر وارث میر، مقالہ: ''عصر حاضر کے تقاضے اقبال اور اجتہاد''، مشمولہ اقبال فکر اسلامی کی تشکیل جدید، پاکستان اسٹڈی سینٹر،، ۲۰۰۸، ص: ۱۳۴، جامعہ کراچی

25۔پروفیسر وارث میر، مقالہ: ''عصر حاضر کے تقاضے اقبال اور اجتہاد''، مشمولہ اقبال فکر اسلامی کی تشکیل جدید، پاکستان اسٹڈی سینٹر،، ۲۰۰۸، ص: ۱۴۳، جامعہ کراچی

26۔نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، بزم اقبال، ۲۰۱۰ء، ص: ۲۲۶۔۲۲۵، لاہور

27۔نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، بزم اقبال، ۲۰۱۰ء، ص: ۲۵۳، لاہور

28۔Iqbal, The Reconstrucitons of the Religious Thought in Islam, 1999, page 214، Lahore

29۔ محولہ بالا، ص: ۱۰۶

30۔ محولہ بالا، ص: ۱۰۸

31۔نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، بزم اقبال ۲۰۱۰ء، ص: ۲۵۲، لاہور

32۔نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، بزم اقبال ۲۰۱۰ء، ص: ۲۵۹، لاہور

33۔ شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، شیخ محمد اشرف، ۱۹۵۱، ج اول، ص ۱۴۷، لاہور

تعلیم وتربیت کی اہمیت

(افکارِامام خمینیؒ کی روشنی میں)

سید رمیز الحسن موسوی*
srhm2000@yahoo.com

کلیدی کلمات: تعلیم وتربیت، تزکیہ ٔنفس ،انبیائے کرام،انسانی روح

خلاصہ

کسی شخص کے رشد و تکامل یا اس کی استعداد کو نکھارنے کے لئے اسباب فراہم کرنے کا نام تعلیم وتربیت ہے۔ اس مقالے میں اس موضوع کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ دین اسلام نے تعلیم وتربیت کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ لہٰذا قرآن میں انبیاء کی بعثت کے ساتھ تعلیم وتربیت کو بھی ذکر کیا گیا ہے۔ تمام انبیاءؑ انسانیت کے معلم ہیں۔انبیاء کے بعد علما نے یہ ذمہ داری پوری کرنی ہے۔ امام خمینیؒ ایک ایسے عالم دین ہیں، جنہوں نے اسلامی تعلیم وتربیت کی روشنی میں ظلم وستم اور جہالت کے ہاتھوں پسے ہوئے انسانوں کو حقیقی تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنے کے لئے عظیم جدوجہد کی ہے۔اس وقت ہمارا پاکستانی معاشرہ مغرب پرست حکمرانوں کی وجہ سے تعلیم وتربیت کے میدان میں بے شمار مسائل سے دوچار ہے۔ایسے معاشرے کے لئے تعلیم وتربیت کے مطلوبہ نظام کے فقدان میں تعلیم وتربیت کی اہمیت سے متعلق امام خمینیؒ کے افکار کا مطالعہ یقیناً مفید ہوگا، وہ افکار کہ جن کی وجہ سے پڑوسی مسلمان ملک اسلامی جمہوری ایران میں تعلیم وتربیت کے شعبے میں ایک عظیم انقلاب آچکا ہے اور اسی نظام کے سائے میں ایک شجاع اور بابصیرت نسل پروان چڑھ رہی ہے۔

*۔مدیر مجلّہ سہ ماہی "نور معرفت" نور الہدیٰ مرکز تحقیقات (نمت) بھارہ کہو، اسلام آباد

مقدمہ

انسانی علوم میں سے ایک اہم موضوع تعلیم وتربیت ہے۔ تعلیم وتربیت کیا ہے ؟اس کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں جن میں سے ایک تعریف بہت واضح اور عام فہم ہے جس کے مطابق: ''ایک خاص مقصد اور طے شدہ لائحۂ عمل کے تحت کسی شخص کو اپنے اختیار سے رشد و تکامل کی طرف لے جانے یا اس کی استعداد وصلاحیتوں کو نکھارنے کے لئے علل واسباب فراہم کرنے کا نام تعلیم وتربیت ہے۔(1)

تعلیم وتربیت سے متعلق لکھی جانے والی کتابوں میں ارسطو، افلاطون، فارابی، ابن سینا، غزالی اور بعض مغربی دانشوروں کی تعریفیں بھی نقل کی گئی ہیں، لیکن سب کا مطمح نظر فرد یا معاشرے کو رشد وتکامل تک پہنچانے کے لئے لائحۂ عمل مرتب کرنے کا نام تعلیم وتربیت ہے۔ آیت اللہ مرتضی مطہری شہید کے نزدیک تعلیم سے مراد متعلّم کی فکری قوت کی پرورش کرنے، اسے استقلال تک پہنچانے اور اس کے اندر پنہان جدت پسندی کی قوت کو بالفعل بنانا ہے، جبکہ تربیت سے مراد کسی چیز میں بالقوہ موجود استعداد اور صلاحیت کو بالفعل بنانا اور اُس کی پرورش کرنا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فقط جانداروں ہی کی تربیت کی جاسکتی ہے، غیر جانداروں کے بارے میں ہم تربیت کی اصطلاح استعمال نہیں کرسکتے۔ کیونکہ غیر جاندار چیزوں کی حقیقی معنوں میں پرورش نہیں کی جاسکتی جیسا کہ ہم ایک پودے، حیوان یاانسان کی پرورش کرتے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ تربیت کو فطرت وجبلت کے تابع ہونا چاہیے۔ بنابریں انسان کی تربیت سے مراد اس کی استعداد کی پرورش کرنا ہے۔ اور یہ استعداد عقلی بھی ہوسکتی ہے، اخلاقی بھی ہوسکتی ہے اور دینی بھی۔(2)

اسلام میں تعلیم وتربیت کی اہمیت

اس مقالے میں اس موضوع کی اہمیت اور تمام موضوعات میں اس کے مقام ومنزلت کے بارے میں بحث مقصود ہے۔ تمام عقلاکے نزدیک انسانی زندگی میں تعلیم وتربیت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے جس کا کوئی بھی ذی شعور انسان انکار نہیں کرسکتا۔ اسی اہمیت کی وجہ سے دین اسلام نے بھی انسانوں کی تعلیم وتربیت کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور اپنی تعلیمات میں ہر انسان پر واجب قرار دیا ہے کہ وہ ماں کی

آغوش سے لے کر قبر تک اپنی تعلیم وتربیت کے لئے سعی و کوشش کرتا رہے۔ انسان فطرتاً تعلیم پذیر اور تربیت کا محتاج ہوتا ہے۔ اور اس کی تمام خفیہ صلاحیتیں اور استعدادیں تعلیم وتربیت ہی کے ذریعے نکھرتی اور پھلتی پھولتی ہیں۔

انسان کا انسان بننا اور اپنے انتہائی کمال تک پہنچنا تعلیم وتربیت ہی کا مرہون منت ہے۔ اگر انسان اپنی زندگی میں تعلیم وتربیت کی فرصت کو ہاتھ سے کھو دے تو وہ اپنے سب سے قیمتی سرمایے سے محروم ہو جاتا ہے۔ تعلیم وتربیت جہاں انسان کی روحانی قوتوں اور صلاحتیوں کو ترقی عطا کرتی ہے وہاں اس کی جسمانی صلاحیتوں کو بھی تقویت پہنچاتی ہے اور انسان کی انفرادی واجتماعی اور معاشی وسماجی ضروریات کو بھی پورا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم وتربیت تمام ادوار میں انسانی تہذیب وتمدن کی بنیاد قرار پاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کے تمام مسائل ومشکلات تعلیم وتربیت کے ذریعے بر طرف ہو سکتی ہیں اور اس کے تمام اُمور اِنہی دو چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلام کی نظر میں جو شخص تعلیم وتربیت سے بہرہ مند نہیں وہ اس شخص کی مانند ہے جو لق ودق بیابان میں حیران وپریشان اور سر گردان پھر رہا ہوتا ہے اور نہیں جانتا کہ کس طرف جائے اور کہاں اپنی منزل تلاش کرے۔

تعلیم وتربیت کے سلسلے میں انسان کی اسی فطری ضرورت کی وجہ سے قرآن مجید نے تعلیم وتربیت کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ لہٰذا جہاں بھی قرآن مجید میں انبیائے کرام کے مبعوث ہونے کا تذکرہ ہوا ہے وہاں تعلیم وتربیت کا بھی ذکر آیا ہے۔ لہٰذا دین اسلام نے انسانوں کے لئے تعلیم وتربیت کا خصوصی اہتمام فرمایا ہے اور اُن کی دنیوی زندگی کے علاوہ اُخروی زندگی کے لئے بھی تعلیم وتربیت کو ضروری سمجھا ہے۔ انسان کو خلق کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا کام اس مخلوق کی تعلیم وتربیت کے لئے الٰہی معلّمین کا انتظام کیا ہے اور دنیا میں پہلا انسان ہی پہلا معلم قرار پایا ہے۔

ہمارے نزدیک تمام انبیائے کرامؑ، انسانیت کے معلم ہیں۔ لہٰذا روئے زمین پر پہلے انسان حضرت آدمؑ کی خلقت کے ساتھ ہی اُنہیں خلعت نبوت سے بھی نوازا گیا ہے تاکہ انسان اپنی خلقت کے ساتھ ہی تعلیم وتربیت کی نعمت سے بھی بہرہ مند ہو سکے۔ انسانوں کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ایک لاکھ

چوبیس ہزار انبیائے کرامؑ کے علاوہ لاکھوں اوصیاء و اولیاء اور معصوم انسانوں کو بھیجا گیا ہے۔قرآن مجید انبیائے کرام علیہم السلام پر تعلیم وتربیت کی ذمہ داری کے بارے میں واضح الفاظ میں فرماتا ہے:

''هُوَ الَّذی بَعَثَ فِی الأُمِّیّینَ رَسُولاً مِنْهُمْ یَتْلُوا عَلَیْهِمْ آیاتِهِ وَ یُزَکّیهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْکِتابَ وَالْحِکْمَةَ''۔(3)

یعنی: ''وہ وہی ہے جس نے اُمیین میں خود اُنہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا تاکہ وہ اس کی آیات کی ان پر تلاوت کرے، انہیں پاک و پاکیزہ کرے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے''۔

قرآن مجید تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ انسانوں میں فرق کا قائل ہے اور ان دونوں کو ایک جیسا نہیں سمجھتا، جیسا کہ آیہ مجیدہ میں آیا ہے کہ

''قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذینَ یَعْلَمُونَ وَ الَّذینَ لایَعْلَمُونَ''یعنی: ''کہہ دو کیا جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے برابر ہیں؟'' (4)

ایک دوسری آیت میں جاہل انسان کو اندھے سے تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا ہے:

'' قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الْأَعْمَی وَالْبَصِیرُ أَفَلاَ تَتَفَکَّرُونَ۔''

یعنی: ''کہہ دو کہ نابینا اور بینا برابر ہیں؟ تم اس پر غور کیوں نہیں کرتے؟'' (5)

اسلامی تعلیمات میں ماں باپ پر اولاد کے سلسلے میں دوسری ذمہ داریوں کے علاوہ سب بڑی جو ذمہ داری عائد کی گئی ہے وہ یہی تعلیم وتربیت ہے۔ ماں باپ پر واجب ہے کہ وہ جہاں بچوں کی مادی ضروریات پوری کریں وہاں اُن کی معنوی اور روحانی تربیت کا بھی اہتمام کریں۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں آباء واجداد کی جانب سے اولاد کے لئے بہترین میراث، ادب اور اچھی تربیت ہے۔(6)

امام خمینیؒ اور تعلیم وتربیت کی اہمیت

انبیائے کرام، اولیائے عظام اور معصومین علیہم السلام کے بعد ہر دور کے علمائے ربانی نے بھی انسانوں کی تعلیمی وتربیتی ضرورت کے لئے بے شمار زحمتیں برداشت کی ہیں اور وہ آج تک پورے عالم انسانیت کو مہذب بنانے کے لئے سعی وکوشش کررہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عصر حاضر میں انبیاء اور اولیاء

کے علمی و معنوی وارث علمائے کرام ہیں۔اس دور کے علماء میں سے ایک حضرت امام خمینیؒ بھی ہیں کہ جنہوں نے اسلامی تعلیم وتربیت کی زندہ تعلیمات سے کسب فیض کرتے ہوئے اپنے دم مسیحائی سے بڑی طاقتوں کے ظلم وستم اور جہالت کے ہاتھوں پسے ہوئے اور غمزدہ انسانوں کی رہائی، انہیں حیات نو عطا کرنے، ان کی تشنہ روح کو سیراب کرنے اور انہیں حقیقی تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنے کے لئے عظیم جدوجہد کی ہے۔

خوداُن پر الٰہی تعلیم وتربیت کی گہری چھاپ تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے قول وفعل میں ایک جیسے تھے۔وہ ایک نمایاں دینی اور علمی شخصیت کے مالک تھے اوراُنہوں نے اپنی اسی شخصیت سے استفادہ کرتے ہوئے لاکھوں انسانوں کے لئے دینی واخلاقی تعلیم وتربیت کا میدان فراہم کیااور آج اُن کی جدوجہد کے نتیجے میں قائم ہونے والی اسلامی حکومت تعلیم وتربیت کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دے رہی ہے اور اُن کے بچھائے ہوئے تعلیمی وتربیتی دستر خوان سے پوری دنیاکے مسلمان بہرہ مند ہورہے ہیں۔

امام خمینیؒ کے تعلیمی وتربیتی افکار خالص الٰہی افکار ہیں اور وہ الٰہی بنیادوں پر انسانوں کی تربیت اور تعلیم کے قائل تھے،وہ تعلیم وتربیت کہ جس کے داعی انبیائے کرامؑ تھے اور جس کی بنیادیں انہی الٰہی نمائندوں نے رکھی تھیں۔ امام خمینیؒ کے افکار کے مطابق اسلام وقرآن،انبیاءاورائمہ اطہار علیہم السلام سب ہی انسانوں کی تربیت میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔مثلاً قرآن انسانی تربیت اور تعمیر کردار کی کتاب ہے۔اُن کے نزدیک دین اسلام اور یہ الٰہی و توحیدی مکتب، انسان کی اُس کے وجود کے تمام پہلوؤں میں تربیت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

حضرت امام خمینیؒ نے تعلیم وتربیت کی اہمیت کے متعلق بارہا اشارہ کرتے ہوئے کہاہے کہ ہم سب کی مشکلات کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم نے نہ اپنا تزکیہ کیا ہے اور نہ تربیت۔وہ تہذیب نفس اور پاکیزہ اخلاق کے حصول اور کوشش کو اہم ترین کاموں اور واجب ترین عقلی واجبات میں سے شمار کرتے تھے۔اُن کے نزدیک تربیت کی اہمیت کیلئے بس اتناہی کافی ہے کہ بعثت انبیاء کی غرض وغایت انسانوں کی تعلیم وتربیت ہے۔

امام خمینیؒ علم و تعلیم کے بلند مقام ومرتبے کے بارے میں علم کو دنیاوآخرت کی سعادت کا باعث قرار دیتے ہوئے تاکید کرتے ہیں کہ علم کو تربیت کیلئے حاصل کرنا چاہیے۔ لیکن اس نکتہ کی جانب توجہ بہت ضروری ہے کہ وہ اس علم و تعلیم کی تاکید کرتے ہیں جو بامقصد ہو اور کسی خاص مقصد کیلئے حاصل کی جائے اور وہ جہت ومقصد فقط خدااور خدا کی طرف توجہ ہونا چاہیے۔امامؒ کے نزدیک اگرچہ کہ انبیائے کرامؑ کا اصل کام لوگوں کی تربیت تھی اس کے باوجود امام خمینیؒ اس کی جانب بھی اشارہ فرماتے ہیں کہ اپنی عملی زندگی اور کاموں میں استقامت وپائیداری اختیار کرنا، ممالک کی ترقی اور ان کے استقلال کیلئے مختلف شعبوں کے ماہرین، سنجیدہ اور ذمہ دار افراد کی تربیت بھی انبیاء کے دستور وآئین کے بنیادی نکات میں شامل ہے۔

اس وقت ہمارا موجودہ پاکستانی معاشرہ مغربی طاقتوں کے زیر اثر اور سیکولر مغرب پرست حکمرانوں کی وجہ سے جہاں اور بہت سی ثقافتی مشکلات کا شکار ہے وہاں تعلیم وتربیت کے لحاظ سے بھی بے شمار مسائل سے دوچار ہے۔یہی وجہ ہے کہ ملت کے نونہال اور نوجوان تعلیم وتربیت کے مہنگے ترین نظام کے باوجود، اُس تعلیم وتربیت سے بہرہ مند نہیں ہو سکتے جو قرآن وسنت کی مطلوب تعلیم وتربیت ہے۔ایک مسلمان اور مؤمن معاشرے کے لئے تعلیم وتربیت کے اسی مطلوبہ نظام کے فقدان میں تعلیم وتربیت کی اہمیت سے متعلق حضرت امام خمینیؒ کے افکار کا مطالعہ یقیناً مفید ہوگا، وہ افکار کہ جن کی وجہ سے پڑوسی مسلمان ملک اسلامی جمہوری ایران میں تعلیم وتربیت کے شعبے میں ایک عظیم انقلاب آچکا ہے اور اسی تعلیمی وتربیتی نظام کے سائے میں ایک شجاع، مدبر اور بابصیرت نسل پروان چڑھ رہی ہے۔

ذیل میں ہم مختلف عناوین کے تحت امامؒ کے بیانات اور فرامین کی روشنی میں تعلیم وتربیت کی اہمیت کے بارے میں ایک مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

انسانی روح کی اہمیت

اسلامی تعلیمات کے مطابق انسان کی اصل واساس، اُس کا مادی بدن نہیں ہے بلکہ اس کی روح ہے۔انسان جب تعلیم وتربیت کے زیور سے آراستہ ہوتا ہے تو درحقیقت وہ اپنی روح کو مہذب بناتا ہے نہ بدن کو، البتہ روح ونفس کے مہذب ہونے کی وجہ سے انسان کا بدن اور جسم بھی نورانیت حاصل کرلیتا ہے۔ اس لئے

امام خمینیؒ اور دوسرے اسلامی فلاسفہ کے نزدیک اس کائنات میں جس کی چیز کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، وہ انسان کی روح ہے، جس کو مہذب بنانے کے لئے انسان کو ہر کوشش کرنی چاہیے اور اُس تعلیم وتربیت سے بہرہ مند ہونا چاہیے جو انسان کی روح کو مہذب بنانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ چونکہ اسی روح اور نفس نے ہی ابدی دنیا میں جانا ہے اور ابدی زندگی گزارنی ہے۔ لہٰذا روح ونفس کی اہمیت کے بارے میں ''چہل حدیث'' میں امامؒ لکھتے ہیں:

''جان لو کہ انسان کی ان مختلف باطنی صورتوں کہ جن میں سے ایک انسانی صورت ہے، عالم برزخ کے آغاز اور سلطنت آخرت کے غلبہ وتسلّط کہ جس کی ابتدا عالم برزخ سے ہی ہوتی ہے، کا معیار ومیزان روح (نفس) کا بدن سے نکلنے کا وقت ہے۔ انسانی روح بدن سے نکلتے وقت جس عادت وملکہ سے اس دنیا سے رخصت ہوگی اسی ملکہ وعادت کے مطابق آخرت میں شکل پائے گی۔ برزخ کی ملکوتی آنکھیں اسے دیکھیں گی اور وہ خود بھی اپنی برزخی آنکھوں کے کھلتے وقت اپنے آپ کو اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں دیکھے گا البتہ اگر اس کی (برزخی) آنکھیں ہوئیں تو ضروری نہیں ہے کہ جو اس دنیا میں جس شکل وصورت کا مالک ہو آخرت میں بھی وہی شکل وصورت رکھتا ہو۔

خداوند عالم روز محشر بعض افراد کے قول کو نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''خدایا! مجھے نابینا کیوں محشور کیا جبکہ میں دنیا میں بینا تھا؟'' خداوند عالم جواب دے گا: ''چونکہ تم نے ہماری نشانیوں کو فراموش کردیا تھا اسی طرح آج تم کو فراموش کردیا گیا ہے۔'' (7) اے بے چارے انسان! تم دنیا میں صرف ظاہری آنکھوں والے اور سطحی بینائی کے مالک تھے لیکن تمہارا باطن تاریک اور چشم ملکوت نابینا تھی۔ تم نے آج اپنی نابینائی اور اندھے پن کا ادراک کیا ہے درحالیکہ تم تو پہلے ہی سے نابینا تھے۔ تم آیات خدا اور اس کی نشانیوں کا مشاہدہ کرنے والی چشم بصیرت اور باطنی بینائی کے مالک نہیں تھے۔ اے بے چارے انسان! تم صرف ملکی (مادی وظاہری اور) اچھی شکل وصورت اور ظاہری قد وقامت کے مالک تھے۔ (لیکن) دنیائے ملکوت اور باطنی عالم کا میزان یہ سب چیزیں نہیں ہے۔

تمہیں چاہیے کہ باطنی (روحانی) قدوقامت حاصل کرو تاکہ روز قیامت تمہاری شکل وصورت اور قدوقامت صحیح وسالم ہو۔ تمہیں چاہیے کہ تمہاری روح، انسانی روح ہو تاکہ عالم برزخ اور روز محشر، انسانی صورت کو پاسکو۔ تم یہ خیال کرتے ہو کہ عالم غیب وباطن کہ جو رازوں کے منکشف ہونے اور ملکات (انسانی پختہ عادتوں) کے ظہور کا عالم ہے، ظاہری عالم اور مادی دنیا کی مانند ہے کہ جہاں دھوکہ اور فریب سے کام نکال لیا جائے گا؟ تمہاری آنکھیں، کان اور دست وپا سمیت تمام اعضا اپنی ملکوتی زبان سے بلکہ بعض افراد کے قول کے مطابق ملکوتی شکل وصورت میں تمہارے ہی خلاف گواہی دیں گے۔" (8)

عقل کی نظر میں سب سے اہم کام

عقل کے نزدیک سب سے اہم کام تہذیب نفس ہے جس کے ذریعے انسان نفسانی خواہشات اور شیطانی وسواس سے نجات حاصل کرسکتا ہے۔ لہٰذا انسان کو ایسی تعلیم وتربیت حاصل کرنی چاہیے جو اس کی اس مقصد کی تکمیل میں مددگار ثابت ہو۔ لہٰذا امام خمینیؒ کے مطابق:

" تہذیب نفس اور پاکیزہ اخلاق کے حصول کی کوشش کرنا جو درحقیقت شیطان کے تسلّط اور اس کی حکومت سے آزاد ہونا ہے، سب سے اہم ترین کام اور عقلی طورپر سب سے زیادہ واجب امر ہے۔" (9)

باطنی نورانیت کی اہمیت

امام خمینیؒ کے نزدیک تہذیب نفس ایک دائمی عمل ہے جس میں توقف جائز نہیں۔ ایسا نہیں کہ انسان ایک ماہ تو تقویٰ وپرہیزگاری کے ذریعے تہذیب نفس کرتا رہے اور اس کے بعد اس کو چھوڑ دے اور اپنے نفس سے غافل ہو جائے۔ چونکہ نفس اور روح کی تہذیب سے دل کی نورانیت اور پاکیزگی حاصل ہوتی ہے جس کے لئے مسلسل جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے تہذیب نفس سے متعلق تعلیم وتربیت کا عمل بھی ایک دائمی اور مسلسل عمل ہے۔ اس لئے امامؒ تہذیب نفس اور سیر وسلوک کے طالب علموں کو وصیت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حق کے طالب کیلئے بہتر یہی ہے کہ وہ حق کے وصول کیلئے اقدامات کرے۔ اگر اس نے اپنے قلب کی نورانیت وطہارت میں کوئی تبدیلی دیکھی اور باطن کی نورانیت کو دریافت کرلیا تو اسے اور زیادہ محنت کرنی چاہیے۔ یہ بات روز روشن کی مانند عیاں ہے کہ یہ تمام امور بتدریج اور طولانی مدت میں انجام پاتے ہیں اور چونکہ ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے لہٰذا انسان کو ان کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔ ان امور کی طرف بے توجہی اور تغافل کا نقصان دنیوی ضرر کی مانند نہیں ہے کہ انسان یہ کہے کہ ''اگر آج یہ کام نہیں ہوا تو کل میں اس کا جبران کردوں گا اور اگر جبران نہ بھی ہوا تو مشکل کی کوئی بات نہیں، دنیا ایسے ہی گزر جائے گی'' یہ ابدی سعادت وشقاوت ہے، ایسی شقاوت وبدبختی کہ جس کی نہ کوئی آخری حد ہے اور نہ اختتام۔''(10)

معنوی تربیت ہی کامل ترین رحمت ہے

امام خمینیؒ کے نزدیک تربیت کی دو قسمیں ہیں ایک مادی تربیت جس کے اثرات فقط اسی مادی دنیا تک محدود ہیں اور دوسری معنوی اور روحانی تربیت ہے کہ جس کی حدود لامتناہی ہیں اور جسے امامؒ رحمت الٰہی کا مصداق قرار دیتے ہیں چونکہ رحمت الٰہی کی کوئی حدود نہیں ہیں:

''تمام رحمتوں میں سب سے زیادہ کامل رحمت، معنوی تربیت کی نعمت ہے کہ جو بنی نوع انسان سے ہی مخصوص ہے، مثلاً کتب سماوی اور انبیاء مرسلین کا بھیجا جانا۔''(11)

بچوں کی تربیت کی اہمیت

دوسرے تعلیمی وتربیتی ماہرین کی مانند امام خمینیؒ کے نزدیک بھی بچوں اور نوجوانوں کی تربیت اور تعلیم بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے جس سے غفلت ناقابل تلافی نقصان کا سبب بنتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''ابتدا میں بچوں کی روح سادہ کاغذ کی طرح صاف ہوتی ہے اور وہ ہر نقش کو آسانی سے قبول کرلیتی ہے۔ پھر جب اس پر کوئی چیز نقش ہوجاتی ہے تو اسے آسانی سے مٹایا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ بچے جو معلومات اور عادات بچپنے میں سیکھ جاتے ہیں وہ بڑھاپے کی انتہا تک برقرار رہتی ہیں۔ ایام طفولیت میں حاصل ہونے والی

معلومات پر نسیان کا حملہ بہت کم واقع ہوتا ہے۔ بنابریں بچوں کی تعلیم وتربیت والدین کی نہایت اہم ذمہ داری ہے۔ اگر اس ذمہ داری کے معاملے میں سستی اور سہل انگاری سے کام لیا جائے تو بے چارے بچے اخلاق رذیلہ کا شکار ہوجاتے ہیں اور یہ امر اس کی ناکامی اور بدبختی کا موجب بنتا ہے۔

یاد رہے کہ ایک بچے کی تربیت کو ایک کام شمار نہیں کرنا چاہئے۔ اسی طرح ایک بچے کی غلط تربیت یا اس سے غفلت کو ایک غلطی شمار نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ عین ممکن ہے کہ ایک بچے کی تربیت کے نتیجے میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد، بلکہ ایک ملت یا پورے ملک کی اصلاح ہو۔ اس کے برعکس ایک بچے کی خرابی ایک ملک یا ایک قوم کی تباہی وخرابی پر اختتام پذیر ہو۔" (12)

اچھی تربیت سے فطری استعداد کا پھلنا پھولنا

امام رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اچھی تربیت کے بہت دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اس تربیت کا آغاز انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی ہو جانا چاہیے چونکہ انسان پیدائشی طور پر نیک فطرت ہوتا ہے جس کو بعد میں اچھی یا بُری تربیت کے ذریعے اچھا یا بُرا بنادیا جاتا ہے۔ اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے امامؒ لکھتے ہیں:

"انسان پیدائشی طور پر دنیا میں برا بن کر نہیں آیا ہے، بلکہ وہ بہترین اور اچھی فطرت کے ساتھ دنیا میں بھیجا گیا ہے اور وہ خدائی فطرت کا مالک ہے (كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ) (13) کہ جو وہی انسانی فطرت، صراط مستقیم کی فطرت اور فطرت اسلام وتوحید ہے۔ یہ تربیت ہی ہے جو یا تو اس فطرت کی نشو ونما میں مدد دیتی ہے یا پھر اس فطرت کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ یہ تربیت ہی ہے کہ جو ممکن ہے ایک مملکت کو انسانی معاشرے کے کمال مطلوب تک پہنچا دے اور ایک ملک کو صحیح معنی میں انسانی اقدار اور اسلام کا مطلوب ملک بنا دے یا یہی خراب تربیت یا بغیر تربیت کے تعلیم ہی ہے کہ جو ممکن ہے ایسے افراد کی تربیت کرے کہ جن کے ہاتھوں میں ملکی تقدیر اور باگ دوڑ ہو اور وہ ملک کو تباہ وبرباد کردیں۔" (14)

غلط تربیت کی وجہ سے روح کا تنزل

جس طرح انسان پر اچھی تربیت کے دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں،اسی طرح بُری تربیت اور تعلیم بھی انسان کی تباہی وبربادی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔اس نفسیاتی مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے امامؒ لکھتے ہیں:

"انسان ایک ایسا موجود ہے کہ جسے اگر لگام نہ دی جائے یا وہ اپنی خواہشات نفسانی کے مطابق پروان چڑھے اور ایک جنگلی گھاس کی مانند گلستان حیات میں قدم رکھے یا پھر اس کی تربیت نہ ہو تو وہ ماہ وسال کی جتنی بھی سیڑھیاں چڑھے گا یا مقام ومنصب کے جتنے درجات کو بھی طے کرے گا، وہ روحانی طورپر تنزل ہی کرتا رہے گا اور اس کی معنویت اور باطنی دنیا سب سے بڑے شیطان جو شیطان نفس ہے، کے تصرف واختیار میں چلی جائے گی۔"(15)

تزکیۂ نفس بعثت انبیاء کا مقصد

انسان جتنا بھی تعلیم یافتہ ہو اور پڑھا لکھا ہو اگر وہ مہذب نہیں ہے اور اس نے اپنا تزکیہ نفس نہیں کیا تو کسی قسم کی بھی تعلیم اس کے لئے فائدہ مند نہیں ہو سکتی۔امامؒ کے نزدیک تعلیم کے ساتھ بلکہ اس سے پہلے تزکیہ نفس ضروری ہے۔اسی لئے انسان کی پیدائش کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کے تزکیہ نفس کے لئے انبیائے کرامؑ کا انتظام فرمایا ہے۔کیونکہ انسان کی تمام مشکلات تزکیہ نہ ہونے کی وجہ سے ہیں۔اس مطلب کی وضاحت امام خمینیؒ کے ان بیانات سے ہوتی ہے:

"ہماری تمام مشکلات اس لیے ہیں کہ ہم نے نہ تو اپنا تزکیۂ نفس کیا ہے اور نہ ہی تربیت۔ بہت سے لوگ عالم ودانشمند اور مفکر تو بن گئے مگر ان کی تربیت نہیں ہو سکی۔ان کے افکار تو بہت گہرے ہیں لیکن تربیت کی خوبو سے بہت دور۔بشریت پر بے تربیت وبے تزکیہ عالم کی طرف سے آنے والی مشکلات وخطرات مغولوں کے حملوں سے زیادہ ہیں۔انبیاء کے مبعوث ہونے کی غرض وغایت پہلے مرحلے پر یہی تزکیۂ نفس ہے اور اس کے بعد تعلیم۔ اگر انسانی نفوس بغیر تزکیہ نفس اور تربیت، جہاں بھی جائیں اور جس علم کو بھی حاصل کریں خواہ وہ علم توحید ہی کیوں نہ ہو یا معارف الٰہی کا علم، وہ فلسفہ وفقہ ہو یا پھر سیاست کا

میدان، وہ جس شعبہ زندگی میں قدم رکھیں گے، اگر اپنے شیطان باطنی سے رہائی حاصل نہ کرسکے تو ایسے افراد انسانیت کیلئے بہت مہلک ہیں۔" (16)

تزکیۂ نفس سے نور ہدایت کا حصول

تزکیۂ نفس کی اہمیت اور بنیادی کردار کے بارے میں ایک اور مقام پر امام خمینیؒ فرماتے ہیں:

"تزکیہ نفس اس لیے ہے کہ انسان کا باطن نور ہدایت سے جگمگا اٹھے۔ جب تک آپ کا تزکیہ نہیں ہوا ہے جان لیے کہ سرکشی کا خطرہ آپ کے سر پر منڈلا رہا ہے اور جب تک آپ نے اپنا تزکیہ نفس نہیں کیا ہے، علم کا حصول آپ کیلئے خطرناک ہے، بلکہ تمام چیزوں سے زیادہ خطرناک۔ جب تک آپ نے تہذیب وتزکیہ نفس سے اپنے باطن کو آراستہ نہیں کیا ہے اس وقت تک مقام ومنصب کا حصول آپ کیلئے خطر آور ہے اور آپ کو دنیا وآخرت کی ہلاکت سے دوچار کرسکتا ہے۔" (17)

اپنی اصلاح تمام چیزوں پر مقدم ہے

انسان تعلیم یافتہ ہو یا نہ ہو اس کے لئے اپنی اصلاح اور تزکیۂ نفس انتہائی ضروری ہے۔ دنیا کے تمام کاموں کی اصلاح حتیٰ اُمور مملکت کی اصلاح انسانوں کے تزکیہ سے تعلق رکھتی ہے۔ دنیا میں جتنی بھی فاسد حکومتیں بنتی ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ فاسد اور بے تربیت افراد ہوتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی تعلیم یافتہ ہوں۔ تعلیم سے زیادہ اپنی اصلاح اور تربیت کی اہمیت کے بارے میں امام خمینیؒ کہتے ہیں:

"وہ وقت ہمارے لیے مبارک ومسعود ہوسکتا ہے کہ جب ہم اپنی اور اپنے ملک کی تربیت کرسکیں۔ ہر اصلاح کا نقطہ آغاز انسان کی ذات سے شروع ہوتا ہے اور جب تک انسان اپنی تربیت نہ کرے وہ دوسروں کی تربیت نہیں کرسکتا۔ آپ نے دیکھا کہ روز اول سے آج تک یہ تمام حکومتیں خصوصاً یہ آخری زمانے کی حکومتوں میں کہ جن کا آپ میں سے اکثر نے مشاہدہ کیا ہے، زمام کار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں تھی کہ جو اسلامی تربیت کی خوبو سے بہت دور تھے اور جنہوں نے اپنی غلط تربیت کی وجہ سے ہمارے ملک کو ایسی منزل پر لاکھڑا کیا تھا جسے آپ خود ملاحظہ کررہے ہیں۔

ان لوگوں نے ہماری قوم کو ایسے دہانے پر لاکھڑا کیا ہے کہ اب اس کی تربیت واصلاح کیلئے ایک طولانی مدت درکار ہے۔اسی لیے جو چیز ہم سب پر لازم وضروری ہے وہ یہ ہے کہ اصلاح وتربیت کا کام ہم اپنے نفس سے شروع کریں اور اپنے ظاہر کی اصلاح پر اکتفا نہ کریں۔ اصلاح وتربیت کا نقطہ آغاز ہمارا قلب اور فکر وخیال ہونا چاہیے اور ہم روزانہ اس بات کی کوشش کریں کہ ہمارا آنے والا دن ہمارے گزرے ہوئے دن سے بہتر ہو۔ مجھے امید ہے کہ یہ جہاد بالنفس کی منزل ہم سب کو حاصل ہوگی۔۔۔ہم اس دن عید منائیں گے کہ جب ہمارے محتاج، ضرورتمند اور معاشرے کے پسے ہوئے طبقہ سے وابستہ افراد صحیح آسائش والی زندگی اور صحیح اسلامی اور انسانی تربیت کو پالیں گے۔"(18)

تعلیم سے پہلے تہذیب نفس

امام خمینیؒ نے ہمیشہ تعلیم پر تربیت کو مقدم قرار دیا ہے۔وہ تعلیم سے پہلے تزکیۂ نفس کے قائل تھے اور اس بات پر بہت زیادہ زور دیتے تھے۔درج ذیل اقتباس میں بھی امامؒ اسی مطلب کو قدرے کھول کر بیان کرتے ہیں:

"اگر علم ہوتا اور تہذیب نفس نہ ہوتی، اگر بشریت سے انبیاء کو نکال دیا جائے یا یہ فرض کریں کہ انبیاء شروع ہی سے نہ ہوتے اور انسان خود بخود پرورش پاتا تو تمام انسانیت ہلاک ونابود ہوجاتی اور بشریت میں کوئی ایک اچھا انسان پیدا ہی نہ ہوتا۔ یہ جو آج آپ مشاہدہ کررہے ہیں کہ بہت سے افراد نیک ہیں، یہ سب انبیاء الٰہی کی معنوی تربیت کی برکت کے سبب سے ہیں۔انبیاء کی اسی معنوی تربیت کو در حالیکہ تمام افراد نے قبول نہیں کیا تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے دنیا میں اتنی نورافشانی کی ہے کہ بہت سے لوگ اور معاشرے کے پسے ہوئے افراد، نیک راہ کے راہی بن گئے ہیں۔ان افراد میں خرابی اور بگاڑ کم پیدا ہوتا ہے۔

اگر ہم فرض کریں کہ آپ حضرات جو یہ چاہتے تھے کہ معاشرے کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں اور اسی لیے آپ نے تعلیم بالغان جیسی تحریک کا آغاز کیا تو اگر آپ اس

تعلیم کے ساتھ تربیت نہ کریں اور (اپنی اور معاشرے کی) تہذیب نفس کی طرف توجہ نہ دیں تو آپ کا یہ تعلیم دینے کا عمل لاکھ اچھا ہی سہی، لیکن بے قدر وقیمت ہوگا، چنانچہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت لازمی ہے۔اگر ان نونہالوں کی تعلیم کے ذمہ دار حضرات کی توجہ صرف اس جانب ہو کہ صرف ان کو زیور تعلیم سے آراستہ کریں اور آپ ان کی تربیت وتہذیب نفس کیلئے کوئی اقدامات نہ کریں تو آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے وطن کیلئے کوئی ایک مثبت کام اور خدمت انجام نہیں دی۔" (19)

تعلیم وتربیت سعادت کے دو پَر ہیں

امام خمینیؒ کے نزدیک انسانی معاشروں کے لئے فقط تعلیم ہی کافی نہیں ہے جب تک اس کے ساتھ تزکیۂ نفس اور اخلاقی تربیت نہ، اس وقت تک کوئی بھی معاشرہ ،مثالی انسانی معاشرہ نہیں بن سکتا۔امامؒ تعلیم وتربیت کو معاشروں کی بلند پرواز کے لئے دو پَروں سے تشبیہ دیتے ہیں جن کے سہارے وہ عروج وسربلندی کے آسمان پر پرواز کرتے ہیں:

"اگر یونیورسٹی کے پروفیسر حضرات کی توجہ صرف اسی بات پر ہو کہ وہ صرف سبق پڑھائیں، لیکچر دیں اور طالب علموں کو صرف علم دے دیں تو چنانچہ اگر اس تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت نہیں کی جائے اور معنویت وہدایت کا سامان نہ ہو تو وہ یہ جان لیں کہ اس یونیورسٹی سے فارغ التحصیل افراد برائی ہی پھیلائیں گے۔ (پس) اگر مقصد فقط تعلیم دینا ہی ہو اور معنوی تربیت نہ ہو تو پھر یونیورسٹیوں سے جو لوگ نکلیں گے وہ خرابی ہی پیدا کریں گے، دینی مدارس بھی اسی طرح ہیں، اگر دینی مدارس اور حوزہ ہائے علمیہ میں طالب علموں کی تہذیب نفس کیلئے اقدامات نہ کیے جائیں، ان کے اخلاق کو بہتر بنانے کیلئے کام نہ کیا جائے اور معنوی تعلیم کا کوئی انتظام نہ ہو، یعنی صرف تعلیم دی جائے اور صرف علم ہی سے ان کو مالامال کیا جائے تو وہاں سے بھی فارغ التحصیل افراد دنیا کو ہلاکت ونابودی سے دوچار کریں گے۔

پس یہ کہنا چاہیے کہ یہ دو رکن یعنی تعلیم وتربیت ہمیشہ سے ساتھ ساتھ ہیں اور اگر ایک معاشرے میں، ایک ادارے میں یا ایک مدرسے اور یونیورسٹی میں طالب علموں کیلئے ان دونوں ارکان سے ایک ساتھ استفادہ کیا جائے تو اس وقت ہم یونیورسٹی، دینی مدارس اور معاشرے کے تمام افراد سے ان کی ہر قسم کی علمی سطح اور ان کے تمام تر مراتب علمیہ کے ساتھ ہر وقت مستفیض ہو سکیں گے۔

بنابریں، جو چیز اہم ہے وہ زمانۂ طفولیت سے ہی ان نونہالوں کی روح کی پرورش کرنا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ان کی روحانی تربیت کی جائے اور یہ علمی زیور سے مالامال بھی ہوں۔ علم اگر ایک آلودہ قلب اور برے خیالات کے حامل ذہن میں اخلاق کا لبادہ اوڑھ کر وارد ہو تو اس کا ضرر ونقصان نادانی اور سہو کے نتیجے میں ہونے والے ضرر سے زیادہ ہے۔ صحیح ہے کہ نادانی ایک بڑی چیز کا فقدان ہے لیکن اس میں نہ تو کسی کو نقصان پہنچایا جاتا ہے اور نہ ہی کسی کو نابود کیاجاتا ہے۔برخلاف اس چیز کے کہ علم ہو لیکن اخلاق وتہذیب اور انسانی وخدائی خیال وتوجہ کے بغیر، یہی چیز ہے جو انسان کو ہلاکت سے دوچار کرتی ہے۔انبیاء جس قدر تربیت کیلئے زور دیتے تھے اور لوگوں کو مہذب اور تہذیب یافتہ بنانے کیلئے جتنی کوششیں کرتے تھے اتنی سعی علم کیلئے نہیں کرتے تھے۔تہذیب نفس کیلئے زیادہ کوششیں اسی لیے کی جاتی ہیں کہ اس کا فائدہ اور نفع زیادہ ہے۔ہاں! البتہ علم بھی ایک ایسی چیز ہے کہ جو سب کی توجہ کا مرکز رہی ہے لیکن علم کو تربیت کے ساتھ ہونا چاہیے۔یہ وہ دو پر ہیں کہ اگر کوئی قوم چاہے کہ سعادت وخوش بختی کی طرف پرواز کرے تو اسے انہی دو پروں"تعلیم وتربیت"کے ذریعے ہی پرواز کرنی چاہیے۔اگر ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو سعادت کی طرف پرواز ناممکن ہے۔" (20)

*****

حوالہ جات

1۔ فلسفہ تعلیم وتربیت،، دفتر ہمکاری حوزہ ودانشگاہ، ج۱، ص۳۴۱، تہران

2۔ مطہری، مرتضٰی، تعلیم وتربیت در اسلام، ص ۲۳، ۲۲، انتشارات صدرا، تہران

3۔ سورۂ جمعہ، آیت ۲

4۔ سورۂ زمر، آیت ۹

5۔ سورۂ انعام، آیت ۵۰

6۔ کاشانی، محسن فیض، محجۃالبیضا، جامعہ مدرسین، ۱۳۷۱ش، ج۲، ص۲۴۱، قم

7۔ آیۂ شریفہ کی طرف اشارہ ہے: (قالَ ربِّ لِمَ حشرتنی عمیٰ وقد کنت بصیراً قال کذلك تتك آیاتنا فنسیتها وکذلك الیوم تُنسیٰ) (سورۂ طٰہٰ، آیت ۱۲۵ و ۱۲۶)۔

8۔ روح اللہ، خمینی، چہل حدیث، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۱ش، ص۱۵، تہران

9۔ روح اللہ، خمینی، شرح حدیث جنود عقل وجہل، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۱ش، ص۶۸، تہران

10۔ روح اللہ، خمینی، شرح حدیث جنود عقل وجہل، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۱ش، ص۱۰۸، تہران

11۔ روح اللہ، خمینی، شرح حدیث جنود عقل وجہل، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۱ش، ص۱۴۰، تہران

12۔ روح اللہ، خمینی، شرح حدیث جنود عقل وجہل، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۱ش، ص۱۵۴، تہران

13۔ (کل مولود یولد علی الفطرۃ ثم انّ بواہ یھوّدانه وینصرانه ویمجّسانه) ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں۔ (عوالی اللئالی، ج۱، ص۳۵، فصل ۴، ح۱۸)

14۔ روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج۱۴، ص۱۳، تہران

15۔ روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج۱۴، ص۱۵۲، تہران

16۔ روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج۱۴، ص۳۹۱، تہران

17۔ روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج۱۴، ص۳۹۳، تہران

18۔ روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج۱۵، ص۴۹۱، تہران

19۔ روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج۱۶، ص۵۰۰، تہران

20۔ روح اللہ، خمینی، صحیفہ امام، مؤسسہ تنظیم ونشر آثار امام خمینی، ۱۳۸۵ش، ج۱۶، ص۵۰۰، تہران

معاصر اسلامی ریاستوں میں ذرائع ابلاغ کے مناہج

ڈاکٹر محمد ریاض*
riaz.razee@yahoo.com

کلیدی کلمات: مغرب، اسلامی ریاست، جدید ذرائع ابلاغ، مسلم مفکرین

خلاصہ

موجودہ اسلامی ریاستوں میں رائج ذرائع ابلاغ وہی ہیں جو مغرب سے مستعار لیے گئے ہیں اور ان کا استعمال بھی اس طرز سے ہو رہا ہے جیسے دوسرے اقوام عالم کر رہے ہیں۔ اسلامی ریاستوں میں ذرائع ابلاغ کو دو جہتوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلی روایتی ذرائع ابلاغ ہیں جس میں نماز پنج گانہ، نماز جمعہ و عیدین، مدارس و مکاتب اور مساجد و خانقاہ شامل ہیں۔ ذرائع ابلاغ کی دوسری جہت جدید ذرائع ابلاغ ہیں جن کو بصری، سمعی، ربطی اور قرائتی لحاظ سے مختلف اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ کے استعمال کے بارے میں بعض مسلم مفکرین کا مؤقف نہایت سخت ہے، لیکن کلی طور پر اسلامی ممالک میں جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال کیا جارہا ہے۔ مذکورہ مقالہ میں مقالہ نگار نے اسلامی ممالک میں ذرائع ابلاغ کے استعمال اور جدید ذرائع ابلاغ کے بارے میں مسلم مفکرین کی آراء کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔

*۔ علوم اسلامی جامعہ کراچی

مقدمہ

دنیا کی بہت بڑی آبادی میں شمار ہونے کے ناطے مسلم اُمہ دوسری اقوام سے بھی حالتِ ارتباط میں رہتی ہے اور یہ باہمی ربط نہ صرف وقت کا تقاضا ہے، بلکہ اقوام عالم کی مجبوری بھی ہے۔ ماضی میں علمی فضیلت کے باوجود مسلم امراءِ دیگر اقوام سے مضبوط تعلق رکھتے تھے، اب جبکہ مسلمانوں کی علمی حالت پہلے جیسی نہیں رہی، اس لئے طوعاً و کرہاً ان کو دیگر اقوام کے ساتھ روابط رکھنے پڑتے ہیں۔ اغیار (خاص کر مغرب) سے صنعت و حرفت، علوم و فنون اور جدید ٹیکنالوجی کا حصول آج مسلم اُمہ کی بہت بڑی مجبوری ہے۔ لہٰذا ٹیکنالوجی کی روز افزوں پیش رفت کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آنے والے ذرائع ابلاغ بھی انہی ممالک کے ایجادہ کردہ ہیں اور مسلم اُمہ کی غالب اکثریت بغیر حیل و حجت ان ذرائع سے بھرپور استفادہ کر رہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج کی جدید اسلامی ریاستوں میں رائج ذرائع ابلاغ کو دیگر ممالک کے ذرائع ابلاغ سے امتیاز دینا قطعی ناممکن ہے، کیونکہ مسلم اُمہ کے پاس موجود ابلاغیات کے جدید ذرائع مغرب سے ہی مستعار لئے گئے ہیں۔ ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ مغرب کے ایجادہ کردہ ابلاغیات کے جدید ذرائع مسلم ریاستوں کے لئے ناقابل قبول اور اجنبی ہیں۔ تاہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ بعض افراد کی جانب سے اِن ذرائع کو ناپسندیدہ اور خلافِ اسلام قرار دینے کے باوجود مسلمانوں کی غالب اکثریت نے ان سے استفادے کے لئے جواز کی راہ نکال لی ہے۔ لہٰذا تمام قوموں کی مشترکہ میراث سمجھ کر ہم جدید اسلامی ریاست میں رائج ذرائع ابلاغ کو دو بڑی جہتوں میں تقسیم کرتے ہیں:

اول:　روایتی ذرائع ابلاغ

دوئم:　جدید ذرائع ابلاغ

مسلمان ریاستوں میں روایتی ابلاغیات کی تاریخ کافی طویل ہے اور آج کے دور میں بھی اس کی عملداری اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی ریاست کے اولین حاکم (پیغمبر اسلام ﷺ) نے اس نہج کے ارتقاء کے لئے کئی طرح کے اصول وضع کئے۔ اپنی جدوجہد کے دو مختلف ادوار (مکی و مدنی) میں

آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے تین حصے دنیا کے سامنے رکھے۔ ایک حصہ قبل از بعثت کا تھا، جس میں صرف کردار کے ذریعے ابلاغی فرائض انجام دیئے۔ لوگوں نے آپ ﷺ کی خاموش زندگی کا مطالعہ کیا اور عرب معاشرے میں آپ ﷺ کی موجودگی ایک خاموش مصلح کی حیثیت سے تھی۔ تاہم وقتاً فوقتاً پیغمبر اسلام ﷺ سماجی معاملات میں ضرورر دلچسپی لیتے تھے اور قریش مکہ نے آپ ﷺ کی ان سرگرمیوں کو جو سماجی معاملات سے تعلق رکھتی تھیں، کبھی نظرانداز نہیں کیا۔

دوسرے حصے میں باقاعدہ ابلاغ کی بنیاد پڑ گئی اور اصول و مبادیات وضع ہوئے۔ ابلاغ کی پہلی صدا ''اِقْرَأ'' اس حصے کی پہلی اور بنیادی کامیابی قرار پائی۔ تیسرا حصہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تبلیغی جدوجہد کا حتمی نتیجہ تھا۔ اسی حصے میں قرآن پوری جامعیت کے ساتھ نسلِ نو کی طرف منتقل ہوا۔ احادیث کے ذخائر، جنگی و عملی زندگی کے واقعات اور دیگر علومِ اسلامی تخلیقی مراحل سے گزر کر تدوینی شکل اختیار کر گئے۔ جبکہ دینی شعائر کی ایک طویل فہرست اسی دور میں مدوّن ہوئی اور اس کے عملی نمونے آج بھی جوں کے توں نظر آتے ہیں۔ دینی شعائر سے ہماری مراد مسلمانوں کے طریقہ عبادت و معاملات کی نشاندہی ہے۔

اس کی وضاحت ہم یوں کریں گے کہ مسلمانوں کے ہاں مخصوص اوقات میں کئی طرح کی عبادات انجام دی جاتی ہیں جو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جہاد وغیرہم سے موسوم ہیں۔ ان تمام عبادات کی ادائیگی مخصوص اوقات و حالات میں ہی ہو سکتی ہے۔ مقررہ وقت کے مفقود ہو جانے کے بعد ان کی ادائیگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ نماز کی ادائیگی انفرادی بھی ہو سکتی ہے تاہم اجتماعیت کو فوقیت دے کر باہمی ترسیل وتذکر کی اہمیت کو نمایاں کیا گیا ہے۔

روزہ اگرچہ ایک مسلمان کے انفرادی اعمال میں اضافہ کی وجہ قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کے پس پردہ یہ فلسفہ بھی رکھا گیا ہے کہ معاشرے کے دوسرے نادار اور غریب افراد کی روزمرہ کی مشکلات کو درک کیا جاسکے اور یوں اس انفرادیت کا رخ بھی اجتماعیت کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ حج کی افادیت اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ تمام مسلمان رنگ و نسل ختم کرکے ایک مخصوص مقام (خانہ کعبہ) پر جمع ہوں اور ایک دوسرے کے ساتھ حالتِ ابلاغ میں رہیں۔ جہاد کی ترغیب مسلم معاشرے (اسلامی ریاست) کی آبیاری کے لئے دی گئی ہے تاکہ دو پہلو سے اس کی حفاظت ہو سکے:

اول: اگر جہاد بالنفس ہے تو مسلم معاشرے کے لئے ایک بہترین فرد میسر آئے گا اور اس کے توسط سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے، جبکہ معاشرے کی اخلاقی قدریں بھی بلند ہوں گی۔

دوئم: اگر جہاد بالسیف ہے تو پھر جہاد کرنے والا مجاہد اپنی تلوار سے اسلامی ریاست کی محافظت کی طرف راغب ہوگا۔

ان تمام عبادات کے پس پردہ ایک اجمالی حکم نظر آتا ہے اور وہ ہے باہمی میل جول اور ابلاغ وترسیل، یہی وجہ ہے کہ ان دینی شعائر کی انجام دہی میں لوگوں کی بڑی تعداد جہاں ثواب وجزاء کی نیت سے شرکت کرتی ہے وہی ذہن کے کسی گوشے میں یہ جذبہ ضرور کارفرما ہوتا ہے کہ اس شرکت سے ابلاغ وترسیل، آگاہی وآشنائی کا عمل سہولت کے ساتھ انجام پذیر ہوتا ہے۔ جدید اسلامی ریاستوں میں قدیم ابلاغی مناہج کی صورتیں مندرجہ ذیل ہیں:

نمازِ پنجگانہ.... اسلامی ریاست کا ایک ذمہ دار فرد روز مرہ ابلاغی ضروریات جیسے عزیز واقارب سے بات چیت، دوست احباب سے گفتگو، کاروباری وملازمت پیشہ افراد سے باہمی روابط وغیرہ کے علاوہ مخصوص اوقات میں ایک منفرد اور مقدس ابلاغ کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس کو فقہی اصطلاح میں ''نماز'' کہتے ہیں۔ وہ نماز کی ادائیگی کے دوران دو طرح کے ابلاغ سے متصل ہوتا ہے۔

پہلا: خدائے بزرگ وبرتر کی بارگاہ میں حاضری تاکہ اپنے معبودِ حقیقی سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرسکے۔ اس سلسلے میں وہ دن میں پانچ بار اس لئے سربسجود ہوتا ہے کہ اس عمل سے ایک توامر وجوبی کی انجام دہی ہوتی ہے اور دوسرا اس اُمید پر کہ جس مقدس ہستی کے سامنے وہ سربسجود ہورہا ہے اس کے ساتھ سلسلہ کلام جڑا رہے۔ (اسلامی مفکرین نماز کو اللہ تعالیٰ سے براہِ راست کلام کا ذریعہ قرار دیتے ہیں) ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾، ﴿وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ﴾، سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا سے ہم کلام ہے اور بطور عبد اس کا یہ ابلاغ صرف ذاتِ معبود تک محدود ہے۔

دوسرا: اپنے ہی جیسے دیگر نمازیوں کے ساتھ اس کی جان پہچان ہوتی ہے اور پھر اس کے نتیجے میں تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ یہ نماز کے ذریعے منصۂ شہود میں آنے والا دوسرا ابلاغ ہے۔ اسلامی ریاست میں رائج یہ طریقہ ابلاغ (نماز) ایک طرف حاکمِ مطلق (خدا) سے حساس اور قریبی تعلق کی نشاندہی کرتا ہے وہی دوسری جانب سماج میں رہنے والے دو افراد کے درمیان بھرپور تعلق کا پتہ دیتا ہے۔ جدید مسلم ریاستوں میں قائم لاکھوں مساجد میں کروڑوں مسلمان دن میں پانچ مرتبہ اس طریقہ ابلاغ کی ادائیگی کرتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس طریقہ ابلاغ کی روایت بڑی شدومد کے ساتھ برقرار ہے اور مسلمان ماضی کی نسبت آج کثیر تعداد میں یہ عمل انجام دیتے ہیں۔ البتہ جدید دور میں نت نئی ٹیکنالوجی نے اس طریقہ ابلاغ کی جدت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ خاص طور پر لاؤڈا سپیکر جیسی جدید سہولت نے اس عمل (نماز) کی کیفیت کو مسجد کی حدود سے نکال کر محلّہ کی سطح تک پہنچا دیا ہے۔ ماضی میں نماز کی ادائیگی کے دوران صرف اللہ اور بندے کا ہی باہمی تعلق ہوتا تھا۔ لیکن اب ٹیکنالوجی کے توسط سے محلے کے دیگر افراد کو بھی اس عمل سے مستفیض ہونے کا بھرپور موقع مل رہا ہے۔ یوں روایتی ابلاغ کا یہ منہج اسلامی ریاست میں رائج ذرائع ابلاغ میں سے موثر ترین ذریعہ کے طور پر جانا جاسکتا ہے۔

نمازِ جمعہ کے اجتماعات.... نمازِ جمعہ دراصل اسلامی ریاست کے اندر ہفتہ بھر میں رونما ہونے والے واقعات کی استخراجی کیفیت ہے۔ لیکن چونکہ مسلم ریاستیں باقی دنیا سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتیں اس لئے غیر مسلمان ممالک میں رونما ہونے واقعات بھی اس طریقہ ابلاغ کے ضمنی موضوعات ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر نمازِ جمعہ کی اصل روح اللہ تعالیٰ سے ابلاغ ہے تاہم جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا کہ اس عمل سے اجتماعیت کے بھرپور اظہار کے علاوہ معلوماتِ عامہ، ریاست کے دیگر افراد سے شناسائی اور نمازِ پنجگانہ کی طرح اللہ تعالیٰ سے ایک مرتبہ پھر تجدیدِ عہد جیسے سماجی معاہدات کی تکمیل ہوتی ہے۔ اصلِ اصیل کے طور پر خطبہ جمعہ اس ابلاغ کی تکمیل میں نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔

خطبہ کا ابلاغ باخبر شخص (امام جمعہ) ہی کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ باخبر رہنے کے لئے اِرد گرد کے حالات و واقعات خاص کر وہ واقعات جن کا تعلق امورِ مملکت سے ہو، پر گہری نظر رکھنا ضروری ہے۔ جبکہ ایسے واقعات جو براہِ راست اسلامی مملکت سے متعلق تو نہ ہوں تاہم بالواسطہ ان کا تعلق ہو سکتا ہے تو

ایسے موضوعات بھی زیر بحث آ سکتے ہیں۔ جبکہ نمازِ جمعہ میں شریک سامعین (مقتدی) امام صاحب کے توسط سے نہ صرف اپنی دینی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ گاہے بگاہے حالات حاضرہ پر مبنی خبروں سے بھی آشنائی حاصل کر لیتے ہیں۔ چونکہ یہ سارا عمل (نمازِ جمعہ کے آغاز سے لے کر اختتام تک) سننے اور سنانے کے اِرد گرد گھومتا ہے اس لئے بجا طور پر امام جمعہ اور سامعین دونوں حالتِ ابلاغ میں رہتے ہیں۔ لہٰذا خطبہ جمعہ کی افادیت اور بعد ازاں نماز کی حد درجہ تاکید کے ضمن میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ روایتی ابلاغ کا یہ منہج آج کی مسلم ریاستوں میں پوری آب و تاب کے ساتھ رائج ہے اور جدید ٹیکنالوجی کی شراکت داری نے اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

نمازِ عیدین.... اسلامی ریاست میں شوال کے مہینے کی پہلی تاریخ کو عید الفطر اور ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو عید الضحیٰ کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ دونوں اسلام میں عید اور خوشی کے دن ہوتے ہیں۔ یہ بدیہی بات ہے کہ دنیا کی دیگر قوموں کے بھی کچھ مخصوص ایام ہیں اور یہ ایام اُن کے لئے خوشی کا باعث بنتے ہیں۔ البتہ اسلامی ریاست کی رعایا کے لئے یہ دونوں عیدیں جہاں خوشیوں کا باعث بنتی ہیں وہی اسلامی اقدار کی ترسیل کا سبب بھی بنتی ہیں۔ ہزاروں لاکھوں لوگوں کا اجتماع اور پھر دینی حمیت پر مشتمل مخصوص وظائف کی انجام دہی اس بات کی علامت ہے کہ مسلمان اسلاف کی جانب سے ورثے میں ملے دینی شعائر (رمضان و قربانی) کی حفاظت کے ساتھ بھرپور تشہیر بھی کر رہے ہیں۔

مخصوص اذکار پر مشتمل عبادت (نماز) کی ادائیگی کے بعد احکامات و اوامر سے مزین خطبہ اس ابلاغی نہج کا سب سے نمایاں، قابلِ عمل اور قابلِ اثر پہلو ہوتا ہے۔ ان دونوں نمازوں کی ادائیگی مساجد کے علاوہ کھلے میدانوں (عید گاہوں) میں بھی ہو سکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کھلے میدان میں ادا کی جانے والی نماز دیکھنے والے کے لئے عملی ابلاغ کا کام دے سکتی ہے۔

خانہ کعبہ اور فریضہ حج.... حج اجماعِ مسلمین کا مکمل ترین ابلاغی نظارہ ہے۔ اس کی ابلاغی اہمیت کے لئے صرف یہی کافی ہے کہ خدا نے اپنے کلام (قرآن) کے ایک مختصر حصے (سورہ توبہ) کی تبلیغ کا منبع قرار دیا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کو تاکیدی حکم ملا کہ سورہ توبہ کی ابلاغ کے لئے اِس مخصوص دن کا انتخاب کریں اور اُن لوگوں سے بے زاری کا اظہار کریں جو خدا اور رسولؐ کی اطاعت میں نہیں رہنا چاہتے۔

دراصل سورہ توبہ کی ابلاغ ہی خانہ کعبہ اور حج جیسی عبادت کی منفرد شناخت نمایاں کرنے کا سبب بنی کیونکہ اس سورہ کی تبلیغ کے بعد کفارِ قریش کو ممانعت کی گئی کہ وہ آئندہ خانہ کعبہ اور حج جیسے فریضہ کی ادائیگی نہ کریں۔ گویا خانہ کعبہ اور حج کو صرف مسلمانوں سے مخصوص کر دیا گیا۔ آج بھی دنیا بھر کی اسلامی ریاستوں سے تعلق رکھنے والے لاکھوں افراد ہر سال ذی الحج کے مہینے میں خانہ کعبہ میں جمع ہوتے ہیں اور مخصوص فرائض کی ادائیگی کے ساتھ حج جیسے دینی شعائر کی تکمیل کرتے ہیں۔ قبل اس کے کہ حج جیسے روایتی ابلاغ کو چند اور ضروری نکات میں بیان کریں، ہم خانہ کعبہ کی مرکزی اہمیت کو دو حدیثوں کے ذریعے نمایاں کرتے ہیں:

"ھو مسجد فی السمآء یقال لہ الضُراح و ھو بحیال الکعبة من فوقھا حرمتہ فی السماء کحرمة البیت فی الارض یصلّی فیہ کل یوم سبعون الفا من الملائکة لایعودون فیہ أبدا" (1)

یعنی: "وہ آسمان میں ایک مسجد ہے جسے "ضراح" کہا جاتا ہے اور وہ مسجد کعبہ کے شکل کی ہے اور آسمان میں اس کے یعنی خانہ کعبہ کے عین اوپر ہے۔ آسمان پر اس کی عزت و حرمت ایسی ہی ہے جیسے زمین پر خانہ کعبہ کی ہے۔ ہر روز ستر ہزار فرشتے اس میں نماز کے لئے آتے ہیں۔ جو ایک بار آجائیں پھر انہیں دوبارہ آنا نصیب نہیں ہوتا۔"

"وفی روایة عن ابن عباس قال لما اھبط آدم من الجنة إلی الارض قال لہ یا آدم اذھب وابن لی بیتا فطف بہ واذکرنی عندہ کما رأیت الملائکة تصنع بعرشی" (2)

یعنی: "ابن عباس سے مروی ہے کہ جب حضرت آدم جنت سے زمین پر اتارے گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ فرمایا: اے آدم! تم جاؤ اور زمین پر میرے لئے ایک گھر بناؤ اور اس کا طواف کرو اور اس کے سامنے میرا ذکر کرو، جیسا کہ تم نے فرشتوں کو میرے عرش کا طواف کرتے دیکھا ہے۔"

یہ دونوں حدیثیں اسلامی ریاست کے مرکز خانہ کعبہ کی نمایاں پہچان اور اس کی وضاحت کے زمرے میں بیان کی گئیں ہیں۔ ان دونوں حدیثوں کے متن سے درج ذیل نکات اخذ ہوتے ہیں:

- خانہ کعبہ جیسا ایک مرکزی مقام آسمان پر بھی واقع ہے

◈ خانہ کعبہ کی حرمت بھی اس مقام کی حرمت جیسی ہے
◈ ستر ہزار فرشتے روزانہ نماز پڑھنے آتے ہیں
◈ خانہ کعبہ کی تعمیر کا حکم خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے
◈ خانہ کعبہ کی زیارت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی دور کرنے کا سبب بنتی ہے

اس قدر فضیلت سے بھرپور مقام کی زیارت اور بعدازاں حج جیسی اہم عبادت کی ادائیگی اس بات کی دلیل ہے کہ اس مقام کی برتری کا سبب ہر جہت سے ثابت شدہ ہے۔ سال میں ایک دفعہ (حج واجب کے لئے) ہر رنگ و نسل کے لاکھوں افراد خانہ کعبہ کی زیارت کرتے ہیں اور اس اجتماع کی افادیت نہ صرف دینی فرائض کی انجام دہی سے ظاہر ہوتی ہے بلکہ دیگر سماجی امور کی مطلق بجاآوری کا نظارہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس سے قبل سطور بالا میں ذکر کئے گئے ابلاغی مناہج کا دائرہ کار محلّہ یا زیادہ سے زیادہ شہر کی حدود تک ہی ہوتا ہے تاہم حج کا اجتماع بین الاقوامی سطح کی وسعت رکھتا ہے۔ یہاں جمع ہونے والے لاکھوں افراد ایک قصبہ، گاؤں، دیہات، شہر اور ایک ملک کے باشندے نہیں ہوتے بلکہ پوری دنیا کے کونے کونے سے مسلمان کا ایک جم غفیر اُمڈ آتا ہے۔ زبان، رنگ و نسل اور ذات سے قطع نظر یہاں جمع ہونے والے تمام افراد کا باہمی رشتہ توحید و رسالت اور اسلام سے جڑا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاکھوں کا یہ مجمع "لبیک اللھم لبیک" کی صدا سے یکجہتی کا منظر پیش کرتا ہے اور اس دوران دینی فرائض کی ادائیگی کے علاوہ حج کے درج ذیل سماجی معاملات بھی مشاہدہ کئے جا سکتے ہیں:

◈ فقید المثال یکجہتی کا نظارہ
◈ باہمی روابط کا روایتی سلسلہ
◈ ابلاغ و تبلیغ کا تجدیدِ عہد

آخر الذکر دونوں نکات ہمارے موقف یعنی اسلامی ریاست میں روایتی ابلاغ کی شناخت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ کیونکہ حج کی ادائیگی کے دوران ابلاغ کی صورتیں انہی دو نکات سے نظر آتی ہیں۔ مختلف جغرافیائی سرحدوں سے تعلق رکھنے والے افراد کا اجتماع ربط و ضبط کو ظاہر کرتا ہے جبکہ خطبہ حج اور حجاج کی باہمی گفتگو ابلاغی و تبلیغی کیفیت کو بیان کرتی ہے۔ مسلم ریاست میں رائج یہ روایتی ابلاغ بین الاقوامی

تعلقات جیسے اہم سیاسی امور کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔اگرچہ اس کے مبادی ارکان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا تاہم اس کی ادائیگی کے طریقہ میں جدت آ گئی ہے اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آج کے مسلمان نے جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ کرنے کا رواج قبول کر لیا ہے۔ یہاں پر یہ وضاحت بھی کرتے چلیں کہ حج سے ہماری مراد حج واجب اور حج عمرہ دونوں ہیں۔

تبلیغی اجتماعات.... تبلیغی اجتماعات کی نوعیت دو قسم پر مبنی ہے: ایک وہ اجتماعات جو دینِ اسلام کی تبلیغ کی غرض سے منعقد کئے جاتے ہیں اور ان کا تعلق خالصتاً دین کی تبلیغ و تشہیر سے ہی ہوتا ہے۔ دنیا بھر کی مسلم ریاستوں میں عموماً اور برصغیر میں خصوصاً مختلف مسالک کی مذہبی جماعتیں سال میں ایک دفعہ یا حسبِ ضرورت تبلیغی اجتماعات کا انعقاد کرتی ہیں۔ان کا کلی ہدف دینی شعائر کی تبلیغ و ترویج ہے۔اس سلسلے میں باضابطہ وفود ترتیب دیئے جاتے ہیں اور یہ وفود سال بھر شہروں، دیہاتوں اور قصبوں کا دورہ کرتے ہیں۔اب تو اس عمل کا دائرہ کار عالمی سطح تک بڑھا دیا گیا ہے۔

بین الاقوامی سطح پر سب سے بڑا اجتماع پاکستان کے شہر رائے ونڈ میں منعقد ہوتا ہے۔ اس اجتماع کی سرپرستی دیوبند مسلک سے تعلق رکھنے والی تبلیغی جماعت کرتی ہے۔ یہ جماعت اپنے وفود کو غیر ملکی دورے پر بھی بھیجتی ہے جبکہ پاکستان بھر میں ان کے وفود مختلف شہروں، دیہاتوں اور قصبوں کا دورہ کرتے ہیں۔ اس تبلیغی اجتماع کے تربیت یافتہ افراد (مبلغین) زیادہ تر تین نکات کو پیش نگاہ رکھتے ہیں: لوگوں کو تبلیغی جماعت میں شامل ہونے کی عملی دعوت، نماز کی پابندی کی تلقین اور اخلاق حمیدہ و اوصاف رذیلہ کا تذکرہ، باقی موضوعات انہی تین نکات کے زمرے میں بیان کئے جاتے ہیں۔

اس جماعت کی انفرادی پہچان یہ ہے کہ یہ اب بھی روایتی ابلاغ پر انحصار کرتی ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ خاص کر ویڈیو اور تصویر کے بارے میں ان کا موقف سخت گیر واقع ہوا ہے۔ البتہ لاؤڈ اسپیکر کی آمد کے فوراً بعد اس کی حرمت کی قائل ہونے کے باوجود اب بڑی آسانی کے ساتھ اس سے استفادہ کرتی ہے۔ جبکہ دیوبند مسلک سے ہی تعلق رکھنے والی جماعت اسلامی جو اگرچہ سیاسی جماعت ہے تاہم ان کے اجتماعات زیادہ تر مذہبی نوعیت کے ہوتے ہیں، جدید ذرائع ابلاغ سے بھرپور استفادہ کو وقت کی اہم ضرورت

سمجھتی ہے۔ جماعت نے اپنے موقف کی وضاحت اور ذرائع ابلاغ سے قریبی تعلق رکھنے کے لئے ہمیشہ بھرپور اور ٹھوس اقدامات کئے ہیں۔

اس جداگانہ موقف کی وجہ جماعت کے بانی مولانا مودودی کے وہ منفرد نظریات ہیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں میں بیان کئے ہیں۔ بریلوی مسلک سے تعلق رکھنے والی جماعت "دعوتِ اسلامی" کا اجتماع اور اس کے نتیجے میں ترتیب پانے والے مدنی قافلے روایتی ابلاغ کا ایک اور بڑا نظارہ ہے۔ تبلیغی جماعت کی طرح دعوتِ اسلامی بھی مختلف شہروں (بشمول بیرون ملک) کی طرف تبلیغی قافلے روانہ کرتی ہے جس کا مقصد غیر مسلموں کو دین اسلام سے روشناس کرنا اور مسلمانوں کو بھلا ہوا سبق یاد دلانا ہوتا ہے۔

دعوتِ اسلامی اس روایتی ابلاغ پر سختی سے کاربند ہونے کے ساتھ جدید ٹیکنالوجی سے بھی بھرپور استفادہ کرتی ہے۔ ان کے ہاں ویڈیو، تصویر اور دیگر ڈیجیٹل آلات سے استفادہ کرنا معیوب نہیں، بلکہ یہ جماعت اس کے استعمال کو مستحسن سمجھتی ہے۔ مذکورہ بالا تینوں جماعتیں (تبلیغی جماعت، جماعتِ اسلامی اور دعوت اسلامی) الگ الگ نظریات رکھنے کے باوجود بنیادی ہدف یعنی اسلامی تبلیغ پر یکساں موقف رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ اہلحدیث مسلک سے تعلق رکھنے والی جماعت "جماعت الدعوۃ" کا مریدکے میں منعقد ہونے والا اجتماع جبکہ ہندوستان میں ڈاکٹر ذاکر نائیک کے دروس (لیکچرز) جس کے سامعین اجتماع کی شکل اختیار کر جاتے ہیں اور بعض غیر مسلم افراد اس اجتماع میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرنے کا اعلان بھی کرتے ہیں۔

معروف اہلحدیث اسکالر ڈاکٹر اسرار احمد کی جماعت "تنظیم اسلامی" کے ہفتہ وار، مہینہ وار اجتماعات بھی دین اسلام کی تبلیغ کی نیت سے منعقد کئے جاتے ہیں۔ جماعت الدعوۃ، ڈاکٹر عبدالکریم ذاکر نائیک اور تنظیم اسلامی تینوں جماعتیں ایک ہی مسلک (اہلحدیث) سے تعلق رکھتی ہیں اور تینوں کا طریقہ کار بھی ایک ہی ہے یعنی ان تینوں تنظیموں کے تحت اجتماعات تو منعقد ہوتے ہیں تاہم تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی کی طرح ان کے ہاں تبلیغی وفود کا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ بیرونِ برصغیر اخوان المسلمون، حماس اور حزب اللہ جیسی جماعتوں کے اجتماعات بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ البتہ ان تینوں جماعتوں کے اجتماعات تبلیغی سے زیادہ سیاسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔

ہم نے تبلیغی اجتماعات کو اس لئے روایتی ابلاغ کہا کہ چونکہ یہ عمل پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے سے چلا آرہا ہے تاہم صرف تبلیغی وفود کی روانگی کو ہم روایتی ابلاغ میں شامل نہیں کر سکتے کیونکہ اولین اسلامی ریاست میں اس طرح کا کوئی طریقہ کار نہیں تھا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے جن افراد کو مختلف سربراہانِ مملکت اور سرداران قبائل کے طرف بھیجا تھا ان کا وظیفہ فقد خطوط اور پیغام کی ترسیل تھا۔ وہ مبلغ سے زیادہ قاصد اور سفیر کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کا پیغام بھی جامع ہوتا تھا۔ البتہ جدید تبلیغی وفود کی ترتیب اور مختلف ملکوں اور شہروں کی طرف ان کی روانگی کے عمل کو ہم زمانۂ پیغمبر ﷺ کے قاصد اور سفیروں کے ذمہ دارانہ عمل سے تشبیہ دیتے ہیں اور جدید زمانہ میں اس عمل کو ترقی یافتہ شکل قرار دے کر روایتی ابلاغ کے زمرے میں شامل سمجھتے ہیں۔

دوسری قسم ماضی کے اہم واقعات سے تعلق رکھتی ہے۔ ان واقعات کی یاد منانے اور انہیں نسلِ نو کی طرف منتقل کرنے کا سب سے اہم ذریعہ اس دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ تاریخ اسلام کے ایسے بے شمار واقعات ہیں جن کی بازگشت آج بھی اسلامی ریاست کے ہر گھر میں سنائی دیتی ہے اور مسلمان ان واقعات کو انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں یاد رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ ان مشہور و معروف واقعات میں بارہ ربیع الاول (پیغمبر اسلام ﷺ کی ولادت کا دن)، بعض کے نزدیک سترہ ربیع الاول بھی منقول ہے جیسا کہ شیعہ علماء کی غالب اکثریت اس کی معتقد ہے اور دس محرم الحرام (نواسہ رسول حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا دن) شامل ہیں۔ یومِ ولادتِ پیغمبرؐ تمام اسلامی مملکتوں میں منایا جاتا ہے۔ (3)

اس سلسلے میں باقاعدہ اجتماعات منعقد کئے جاتے ہیں اور علماء و دانشور حضرات پیغمبر اسلام ﷺ کی ولادت سے لے کر رحلت تک کے تمام واقعات بیان کرتے ہیں۔ گویا ان اجتماعات کے ذریعے پیغمبر اسلام ﷺ کی پوری زندگی آئندہ نسل کی طرف ابلاغ ہوتی ہے۔ میلادِ نبی کی محافل کا تبلیغی پہلو اس لئے نظرانداز نہیں کیاجاسکتا کہ مسلمانوں نے آغاز سے ہی اس خاص دن سے فائدہ اٹھانے کی روایت ڈالی ہے۔ یہاں پر ہم چھٹی صدی ہجری سے لے کر دسویں ہجری تک کے تین واقعات جو اسلامی مفکرین نے بیان کئے ہیں، کا ذکر کرتے ہیں۔ محدث ابن جوزی (متوفی ۵۹۷ھ) لکھتے ہیں:

"مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ، یمن، مصر، شام اور تمام عالم اسلام کے لوگ مشرق سے مغرب تک ہمیشہ سے حضور اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت کے موقع پر محافل میلاد کا انعقاد کرتے چلے آرہے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہتمام آپ ﷺ کی ولادت کے تذکرے کا کیا جاتا ہے اور مسلمان ان محافل کے ذریعے اجرِ عظیم اور بڑی روحانی کامیابی پاتے ہیں۔" (4)

امام ابن حجر شافعی (متوفی ۸۵۲ھ) رقمطراز ہیں:

"محافل میلاد و اذکار اکثر خیر ہی پر مشتمل ہوتی ہیں کیونکہ ان میں صدقات ذکر الٰہی اور بارگاہِ نبوی میں درود و سلام پیش کیا جاتا ہے۔" (5)

امام قسطلانی (متوفی ۹۲۳ھ) لکھتے ہیں:

"ربیع الاول میں تمام اہل اسلام ہمیشہ سے میلاد کی خوشی میں محافل منعقد کرتے رہے ہیں۔ محفل میلاد کی یہ برکتِ مجرب ہے کہ اس کی وجہ سے سارا سال امن سے گزرتا ہے اور ہر مراد جلد پوری ہوتی ہے۔" (6)

یہاں پر چونکہ ہمارا مقصد ابلاغیات بیان کرنا ہے اس لئے ہم نے ان محافل اور مجالس کو بطور شاہد ابلاغی اصناف شمار کیا ہے اور زیادہ تر ان موارد کا ذکر کیا ہے جو ابلاغ کا باعث بن رہے ہیں۔ جبکہ موجودہ زمانے میں بعض طبقات ایسے ہیں جو ان محافل اور مجالس کے انعقاد کے خلاف ہیں بلکہ وہ ان کو بدعات میں شمار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ صدرِ اسلام کے حالات و واقعات کی مثالیں پیش کرتے ہیں اور یہ نقطہ نظر بیان کرتے ہیں کہ ان موارد کا وجود نہ پیغمبرِ اسلام ﷺ کے دور میں تھا، نہ صحابہ کرام کے دور میں تھا اور نہ ہی تابعین اور تبع تابعین کے دور میں تھا۔ البتہ معترضین کو اس پہلو سے بھی غور کرنا ہوگا کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے دور میں اجتماعات منعقد ہوتے تھے اور بطور شاہد خطبہ حجۃ الوداع اور جمعہ کے اجتماعات کو پیش کیا جاسکتا ہے جبکہ دورِ جدید کے اجتماعات اور مجالس کو انہی اجتماعات پر محمول کرکے استفادہ کی گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔

میلادِ نبی ﷺ کے اجتماعات روایتی ابلاغ کے موثرترین اجزاء میں سے ہیں۔ آج بھی اسلامی ریاستوں میں اس دن کی مناسبت سے بڑے اجتماعات منعقد ہوتے ہیں اور ان کے ذریعے اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ

کی شان کی بھرپور تبلیغ ہوتی ہے۔ دس محرام الحرام کی مناسبت سے بھی پوری اسلامی دنیا میں بڑے تبلیغی اجتماعات منعقد ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان اجتماعات (مجالس) کے خاص موضوعات امام حسین اور واقعہ کربلا سے متعلق ہی ہوتے ہیں تاہم عمومی طور پر اسلام اور شعائر اسلام کی تشہیر وترویج ہوتی ہے۔ ان اجتماعات کا سلسلہ یکم محرم الحرام سے شروع ہوتا ہے اور دس محرم الحرام کو اختتام پذیر ہوتا ہے۔ بعض ممالک میں یہ سلسلہ تین مہینے تک جاری رہتا ہے۔ اسلامی ریاستوں میں رائج روایتی ابلاغ کا یہ منہج روز افزوں ترقی کے ساتھ جدید ذرائع ابلاغ سے ہم آہنگ ہوتا جارہا ہے اور اس تبلیغی پہلو میں نہ صرف جدت آرہی ہے بلکہ نت نئے اصول وضوابط کے ذریعے اسلام کی تشہیر وترویج مسلسل بڑھ رہی ہے۔

مدارس ومکاتب.... اسلام میں تعلیم وتربیت کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود اسلام کی ہے۔ تعلیم، تربیت اور ابلاغ کا جو سلسلہ صدرِ اسلام میں مساجد کے ذریعے انجام پاتا تھا وقت کے ساتھ ساتھ مستقل طور پر دینی مدارس کی شکل اختیار کرتا گیا اور بعد ازاں درس وتدریس کا یہ سلسلہ مسجد کی عمارت سے نکل کر مدرسے کی صورت میں ڈھل گیا اور یوں اسلامی دنیا میں دینی مدارس کو جو مرکزی حیثیت اور شان وشوکت حاصل ہے وہ کسی اور ادارے کو حاصل نہیں ہوئی۔ آج کا دینی مدرسہ دراصل صدرِ اسلام کے تعلیمی، تربیتی اور ابلاغی سلسلے کا ہی ایک تسلسل ہے۔ جدید طرزِ زندگی میں مدارس کا کردار اگرچہ محدود ہو کر رہ گیا ہے بلکہ کسی قدر بدنام بھی، تاہم بحیثیت مجموعی اس کی اہمیت کا وہ پہلو اب بھی برقرار ہے جو شروعات میں اس کی شناخت کا وجہ بن گیا تھا۔ مدارس کی ابتدائی ہیئت کی ایک جھلک درج ذیل حدیث سے واضح ہوتی ہے:

"عن انس بن مالك قال: افلا احدثكم عن اخوانكم الذين كنا نسميهم على عهد رسول الله القرأفذكر انهم كانو سبعين فكانوا اذا جنهم الليل انطلقوا الى معلم لهم بالمدينة فيدرسون الليل حتى يصبحوا... (7)

یعنی: "انس بن مالک سے روایت ہے: فرمایا کہ میں تمہیں تمہارے ان بھائیوں کے متعلق خبر نہ دوں جن کو ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں "قُرَّأ" کے نام سے پکارا کرتے تھے، وہ تعداد میں ۷۰ تھے۔ رات کو مدینہ میں اپنے اُستاد کے پاس جاتے اور صبح تک پڑھتے رہتے..."

مسجد نبوی وہ مدرسہ تھا جہاں ایسی عظیم ہستیاں پیدا ہوئیں۔اس پہلی مسجد سے اس سنت کا آغاز ہوا کہ عبادت گاہوں سے مدارس کا کام لیا جائے۔آج کے مدارس میں اگرچہ دینی اور عقلی علوم کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن اس کے پس پردہ فلسفہ اسلام کی تبلیغ و ترویج ہی ہے۔ موجودہ اسلامی ریاستوں میں دینی مدارس کی ان گنت تعداد ہے۔ سعودی عربیہ، مصر، عراق ، شام،ایران اور پاکستان میں ان مدارس کی تعداد دیگر اسلامی ریاستوں کی نسبت زیادہ ہے۔ پاکستان میں اس وقت مدارس کی تقسیم مکاتب فکر کے لحاظ سے پانچ وفاق میں کی گئی ہے:

وفاق المدارس العربیہ (دیوبندی) تنظیم المدارس اہلسنت پاکستان (بریلوی) وفاق المدارس السّلفیہ (اہلحدیث) وفاق المدارس الشیعہ (اہل تشیع) اور رابطہ المدارس الاسلامیہ (جماعت اسلامی)، ان میں سے ہر وفاق کے تحت سالانہ ۲۰ ہزار مدرسے ایک ملین سے زائد طلبہ کو تعلیم فراہم کر رہے ہیں۔ جبکہ صرف پنجاب میں دینی مدارس کی تعداد ۱۰ ہزار سے زائد بتائی گئی ہے۔(8)

یہاں مدارس کی تعداد لکھنے کا مقصد قطعی یہ نہیں ہے کہ مدارس کی تعداد بیان کی جائے۔ ہمارا مقصد صرف یہ بتلانا ہے کہ مدارس اور ابلاغ کا رشتہ بہت قدیم ہے اور اسلام کے آغاز سے ہی مدارس نے تبلیغی فرائض نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیئے ہیں۔آج بھی مدارس تعلیم و تعلّم کی ترویج و تبلیغ میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔تاہم ہمیں اس حقیقت کو سمجھنا چاہیے اور قبول کرنا چاہیے کہ پرانے انداز کا مدرسہ ،اندازِ تفکّر اور طرزِ تدریس موجودہ زمانے میں عالمِ بشریّت کی رہنمائی نہیں کر سکتا۔ جس طرح ماضی کا مدرسہ اپنے دور کے اعتبار سے علمی و تربیتی لحاظ سے ممتاز اور قابلِ رشک ہوتا تھا اسی طرح موجودہ مدارس کو بھی موجودہ دور کے اعتبار سے ممتاز، قابلِ رشک اور تبلیغی فرائض کے علمبردار ہونے چاہئیں۔

مساجد.... مسلمانوں کی عبادت گاہ کو مسجد کہتے ہیں۔ عموماً اسے نماز کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، مگر تاریخی طور پر یہ کئی حوالوں سے اہم ہیں مثلاً عبادت کرنے کے لئے، مسلمانوں کے اجتماعات کے لئے، تعلیمی مقاصد کے لئے حتیٰ کہ مسلمانوں کے ابتدائی زمانے میں مسجدِ نبوی کو غیر ممالک سے آنے والے وفود سے ملاقات اور تبادلہ خیال کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مساجد سے مسلمانوں کی اولین جامعات (یونیورسٹیوں) نے بھی جنم لیا ہے۔اس کے علاوہ اسلامی طرزِ تعمیر بھی بنیادی طور پر مساجد سے فروغ پایا ہے۔

دین اسلام میں ،عیسائیت کی طرح مسجد فقط ایک معبد نہیں ہے، بلکہ اسلامی معاشرے کا سیاسی ، ثقافتی،ابلاغی مرکز اور علمی و عملی دارالخلافہ ہے۔اس بات کا ثبوت اسلام کی مایہ ناز مسجد، مسجدِ نبوی کی تعمیر اور فعالیت سے ملتاہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے دین اسلام کی تبلیغ کے لئے اسی مسجد کو مرکز بنایا۔ مختلف قبائل کے سربراہ، دیگر ممالک سے آنے والے حکومتی نمائندے اور سرکاری وفود، پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ ملاقات اسی مسجد میں کیا کرتے تھے۔بڑے بڑے باوقار صحابیوں اور زاہدوں کی تربیت اسی مسجد میں ہوئی۔ بعدکے ادوار میں مساجد تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم کے مراکز بن گئیں، جہاں نہ صرف علم کلام پڑھایا جاتا، بلکہ کائنات سے متعلق تمام علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔

خانقاہیں.... خانقاہیں اللہ تعالیٰ کے وہ گھر ہیں جن میں پیغمبر اسلام ﷺ کی روحانی زندگی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ان گھروں میں اللہ کو یاد کیا جاتا ہے اور غور و فکر کے دروازے اور خدا تک پہنچانے والے دریچے وا کئے جاتے ہیں۔ عموماً خانقاہوں کی نسبت اولیاء اللہ کی طرف دی جاتی ہے اور اسلامی نظریات میں اولیاء اللہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے خاص بندے اور باتقویٰ ہوتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی تبلیغ و ترویج میں اولیاء اللہ کی خدمات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ خاص طور پر برصغیر پاک و ہند میں ان کی خدمات ناقابل فراموش اور سریع الاثر سمجھی جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنے کردار اور عمل کے ذریعے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا اور انہی کی کوششوں کے نتیجے میں مختصر سی مدت کے دوران ہندو پاک کی ایک بڑی آبادی اسلام کی طرف مائل ہو گئی۔

البتہ بعض لوگ ان خانقاہوں میں انجام دیئے جانے والے امور کے بارے میں معترض ہیں۔ ان کے خیال میں دھمال، بھنگڑا اور اس جیسے دیگر امور کو اسلامی تعلیمات کے موافق قرار دینا مشکل امر ہے چہ جائیکہ ان کی تبلیغی خدمات کو تسلیم کی جائیں۔ بہرحال چند متنازع امور کی انجام دہی کے باوجود خانقاہوں کی اہمیت کو اس لئے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان سے منسوب بڑے بڑے بزرگوں نے دین اسلام کی تبلیغ میں موثر خدمات انجام دی ہیں۔

اِمام بارگاہیں.... شیعیت کی دینی، علمی، ملی اور انقلابی تاریخ کا سب سے قدیم مرکز ہے۔ محفل و مجالس کے انعقاد سے لے کر درس وتدریس کی آماجگاہ کے طور پر مشہور اس مرکز کی جداگانہ حیثیت چودہ صدیاں

گزرنے کے باوجود قائم و دائم ہے۔ درج بالا سطور میں "چودہ صدیاں" کا جملہ کسی خاص تاریخی واقعہ کے پس منظر میں بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ ہمارے ہاں عام طور پر "کربلا اور امام بارگاہ" کو ایک ہی تاریخی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جبکہ کربلا کے دلخراش واقعہ سے قبل بھی امام بارگاہ کی باقاعدہ حیثیت قائم تھی۔ اسلامی تاریخ کی اولین امام بارگاہ آنحضرت ﷺ کے وصال کے بعد سیدہ کونین حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کی خواہش پر تعمیر کی گئی اور اس کے معمار مولائے کائنات حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام تھے۔ مؤرخین نے اولین امام بارگاہ کی وجہِ تعمیر یہ بیان کی ہے:

"پیغمبر رحمت ﷺ کی وفات کے بعد زہرا مرضیہؑ کو یک گونہ سکون حاصل نہ ہوا۔ باپ کی جدائی خاتون جنتؑ پر بہت گراں تھی۔ غم کے اس ماحول میں کوئی تسلی دینے والا نہ تھا۔ سوائے شوہر نامدار حضرت علیؑ اور حسنین شریفینؑ کے، ہر ایک نے چپ سادہ لی تھی۔ یہ بے رُخی تو ایک طرف، لوگوں نے سیدہ کونین سلام اللہ علیہا کے رونے کو بھی گراں سمجھا۔ انصار مدینہ حضرت علیؑ کے پاس آئے اور کہا یا علیؑ، زہراؑ سے کہیے کہ وہ رونے کیلئے دن کا انتخاب کرے یا رات کا۔ ہر وقت روتے رہنے سے ہمیں کوفت محسوس ہوتی ہے۔ جناب سیدہ نے حضرت علیؑ سے کہا اے ابوترابؑ مجھے الگ ایک گھر بنا کے دیجئے تاکہ میں اپنے بابا کیلئے جی بھر کے رو سکوں۔" (9)

جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کیلئے الگ گھر (امام بارگاہ) بنا۔ تاریخ اس گھر کو "بیت الحزن" کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کے وصال کے بعد ہی امام بارگاہ کا رواج قائم ہوا۔ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد تو امام بارگاہوں اور عزاء خانوں کی تعمیرات منظّم طریقے سے منصہ شہود میں آئیں۔ جدید دور میں امام بارگاہ شیعیت کی منفرد اور ابلاغی پہچان بن چکی ہے۔

روایتی طرزِ ابلاغ پر اجمالی بحث اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والے چیدہ چیدہ نکات کی وضاحت کے بعد اب ہم اسلامی ریاست میں رائج جدید ذرائع ابلاغ کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا کہ اسلامی ریاست میں رائج ابلاغ کی دو قسمیں ہیں: ایک روایتی ابلاغ اور دوسری جدید ذرائع ابلاغ، روایتی ابلاغ کو ہم نے نمازِ پنجگانہ، نمازِ جمعہ، نمازِ عیدین، مدارس و مکاتب اور مساجد و خانقاہوں کے ضمن میں بیان کیا ہے اور جدید ذرائع ابلاغ کی توضیح ان اقسام کے ذریعے کریں گے:

بصری: جس کا تعلق دیکھنے سے ہے، مثلاً ٹیلی ویژن، وی سی آر، ویڈیو، ڈش، ڈی وی ڈی، سی ڈی، کیبل وغیرہ
سمعی: جس کا تعلق سننے سے ہے، جیسے آڈیو کیسٹ، ایم پی تھری، ریڈیو، ٹیپ ریکارڈر اور باجے وغیرہ
ربطی: جس کا تعلق باہمی روابط سے ہے، جیسے موبائل فون، ای میل، جی میل، فیکس، بلاگز، سوشل نیٹ ورکنگ، مائیکرو بلاگز، ویکیز پروڈکٹس، ڈسکشنز فورمز، آر ایس ایس فیڈز، فوٹو شیئرنگ، مائی اسپیس، فیس بک، ٹویٹر، لنگڈان، یوٹیوب، ویکی پیڈیا، پنٹرسٹ، ڈیونٹ آرٹ، لائیو جرنل، ٹیگ، آرکٹ، کیفے موم، نینگ، میٹ اپ، مائی لائف، آسک ایف ایم وغیرہ شامل ہیں۔(10)
قرائتی: جس کا تعلق پڑھنے سے ہے، جیسے اخبار، جرائد، رسالے، طباعتی کتب و مواد، سائن بورڈ، ویب سائٹس اور مجلے وغیرہ

آخر الذکر نوع کی اہمیت، ضرورت وافادیت کے بارے میں کسی کو کلام نہیں کیونکہ آج کے قرائتی ابلاغ (ویب سائٹس کے علاوہ) کسی حد تک روایتی ابلاغ کی ترقی یافتہ شکل ہے اور دنیا کے ہر ملک میں اس کا رواج عام ہے۔ البتہ ایک اسلامی ریاست میں اول الذکر تینوں قسموں کی شرعی حیثیت اور ان سے استفادہ کی راہ متعین کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ بہت سے مسلمان مفکرین ان کے جواز کے بارے میں تذبذب کا شکار ہیں۔ کئی ایک نے ان آلات کی حرمت کا فتویٰ دے کر خود کو ان جدید ذرائع سے الگ کرلیا ہے جبکہ بعض کے نزدیک اضطرابی حالت میں ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ تین مختلف نظریات کی روشنی میں ایک عام مسلمان کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ جواز یا حرمت میں سے کس کو قبول کرے۔

یہاں یہ واضح رہے کہ جدید ذرائع ابلاغ کے بارے میں سخت گیر موقف چند گنے چنے مفکرین کی طرف سے سامنے آیا ہے اسلامی مملکتوں کا یہ مؤقف نہیں۔ یعنی ذرائع ابلاغ کے خلاف سخت مؤقف انفرادی عمل ہے اجتماعی نہیں۔ ریاستی سطح پر ہر ملک میں مندرجہ بالا ذرائع ابلاغ کا استعمال بڑی شدومد کے ساتھ ہورہا ہے۔ لہٰذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلامی ریاست کے حکمران جدید ذرائع ابلاغ سے آشنا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ تاہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی ممالک میں جس قدر ذرائع ابلاغ کی ایجادات ہوئیں اسی سرایت کے ساتھ مسلم ممالک میں ان کا استعمال بھی بڑھنے لگا۔ مسلم ریاستوں میں ان ذرائع ابلاغ کی آمد پر تین طرح کے طرزِ عمل سامنے آئے:

اول: روایتی مذہبی طبقے نے ان ذرائع ابلاغ کی قبولیت کے بارے میں کفر و اسلام کا سا رویہ بنا رکھا۔ چونکہ یہ طبقہ مسلم معاشرے میں معتبر ادارے کی حیثیت رکھتا تھا اس لئے ان ذرائع کے استعمال یا عدم استعمال کے حوالے سے عام لوگوں کو ان کی طرف رجوع کرنا تھا یوں جواز اور عدم جواز جیسے مباحث معرضِ وجود میں آئے۔ تعجب انگیز مقام یہ ہے کہ جو طبقہ ان آلات کے استعمال کو ممنوع قرار دیتا تھا بعد ازاں خود ہی اس کے استعمال سے مستفید ہونے لگا۔ لاؤڈ اسپیکر کی آمد کے فوراً بعد اس کی حرمت کا فتویٰ اور بعد میں اس کے جواز کا معاملہ اس نوع کی مثال ہے۔

دوم: دوسرا طرز عمل مسلم ریاست کے حکمرانوں اور ان کی اشرافیہ اور دانشور حضرات کی طرف سے سامنے آیا۔ انہوں نے نہ صرف جدید ذرائع ابلاغ کو خوش دلی سے قبول کیا، بلکہ ان کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ البتہ حکمرانوں اور اشرافیہ کا رویہ اخلاقیات سے زیادہ کاروباری نظر آیا اور نتیجے کے طور پر آج مسلم ریاستوں کی اکثریت مغرب کی بھونڈی نقالی کرتے ہوئی نظر آتی ہے۔

سوم: تیسرا طرزِ عمل ایسے اہل علم کی جانب سے پیش آیا جو کہ دور جدید سے بھی پوری طرح واقف تھے اور دین میں بھی گہری بصیرت کے حامل تھے۔ ان اہل علم کی جانب سے جدید ذرائع ابلاغ کا جائزہ لے کر ان کے مثبت پہلوؤں کو اختیار کرنے اور ان کے منفی پہلوؤں سے اجتناب کرنے پر زور دیا گیا۔ بطور مثال ۸۰ء کی دہائی سے قبل کی شخصیت مولانا مودودی کی دی جاسکتی ہے جبکہ آج کی دنیا میں مصر کے معروف مفکر یوسف قرضاوی اور ہندوستان کے ڈاکٹر عبدالکریم ذاکر نائیک کی ہو سکتی ہے۔

مذہبی بنیاد پر دنیا کی واضح تقسیم کے باوجود ذرائع ابلاغ کی مجموعی ہیئت مشترک ہے اور آج کی مسلم ریاستوں میں جدید ذرائع ابلاغ کی وہی نوعیت و ہیئت ہے جو دیگر ممالک میں ہے۔ حرمت و اباحت جیسے موضوعات کی جکڑبندیوں میں بندھے ہونے کے باوجود مسلم اُمہ نے بھی ذرائع ابلاغ کے حوالے سے وہی روش اپنائی ہے جو دیگر اقوام میں رائج ہے۔ ٹیلی ویژن، ریڈیو، اخبارات، انٹرنیٹ، سماجی میڈیا سمیت ہر نوع کا ذریعہ مسلمانوں کے پاس موجود ہے حتی کہ بعض ایسے ذرائع بھی مسلم معاشرے میں عام ہیں جن کو پسندیدہ نہیں سمجھتا جاتا بلکہ یہ عدمِ جواز کے زمرے میں داخل ہیں۔

جیسے میوزک (گانا) کے چینلز، مخرب الاخلاق فلمیں دیکھانے والے چینلز جیسے ایچ بی او وغیرہ، مرد و عورت کی مخلوط مجالس کی تشہیر کرنے والے ادارے، بعض ایسے میگزین جو سرِورق پر نیم عریاں خواتین کی تصویر شائع کرتے ہیں، ان کا رواج بھی مسلم معاشرے میں عام ہے۔ چونکہ یہ تمام ذرائع مسلمان ماہرین نے ایجاد نہیں کئے اس لئے ان کی بیخ کنی کسی صورت ممکن نہیں البتہ اسلامی ریاست کے اندر ان ذرائع کو محدود کیا جاسکتا ہے یا ان کے متبادل ایسے ذرائع قائم کئے جاسکتے ہیں جو بجائے مخرب الاخلاق فلموں، ڈراموں اور کہانیوں کی تشہیر کریں، اسلامی شعائر کی ترویج کرنے والے آلات ثابت ہوں۔

فی الحال مسلم ریاستوں میں ذرائع ابلاغ کا کوئی ایسا ادارہ قائم نہیں ہے جو مندرجہ بالا ذرائع کا متبادل بن سکے۔ تاہم چند ایک ایسے ادارے ہیں جنہوں نے اپنی شناخت کو بطور مسلم تعارف کرایا ہے اور ان کی مساعی اسلام اور مسلمانوں کے لئے وقف نظر آتی ہیں۔ ان معروف ابلاغی اداروں میں قطر کے ٹیلی ویژن چینل "الجزیرہ ٹی وی چینل" سرفہرست ہے۔ اپنی منفرد خبروں، تجزیوں اور مسلمانوں سے متعلق ہمدردانہ تبصروں کے موجب متعدد بار اس چینل کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ حقیقت ہے کہ الجزیرہ ٹی وی چینل مکمل طور پر شرائع دینی کا خیال نہیں رکھتا اور نہ ہی صبح شام تبلیغ اسلام میں مصروف ہے۔ دنیا کے دیگر ابلاغی اداروں کی طرح ان کے اوقات کار بھی خبروں، تجزیوں اور تبصروں میں منقسم نظر آتے ہیں اور خبریں پڑھنے والی خواتین (اینکرز) حجاب کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتیں، لیکن اس کے باوجود اس کی مساعی کو شک کی نگاہ سے نہ دیکھنے کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جاری پروپیگنڈہ مہم کا حامی ہے اور نہ ہی شریک کار۔ لہٰذا ایک مسلم ریاست کی ملکیت ہونے کے ناطے اس کی ہمدردیاں بہرحال مسلمانوں کے ساتھ ہیں اور اسلام کی بہت زیادہ نہ صحیح بقدرِ ضرورت حمایت کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ڈھونڈتا ہے۔

پریس ٹی وی ایران کا زیر ملکیتی چینل ہے۔ اپنے پیش رو الجزیرہ ٹیلی ویژن کے مقابلے میں یہ نوزائیدہ ہے۔ پریس ٹی وی کے قیام کے پس پردہ مقصد مغربی ممالک کے تحت کام کرنے والے چینلوں خاص طور پر بی بی سی، سی این این اور دیگر ہم عصر ابلاغی اداروں کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس سلسلے میں اس کو کافی کامیابی بھی ملی ہے اور مختصر سے عرصے میں اس نے مسلم دنیا کی کثیر آبادی کو متاثر کیا ہے۔ البتہ اس کی اہمیت کو تسلیم کرنا

اس لئے مشکل ہوگا کہ اس کے قیام سے قبل مشہور و معروف ٹی وی چینلوں کا چرچا عام تھا اور ان کی ساکھ بھی متاثر کن تھی۔ لہٰذا پریس ٹی وی کے قیام کو مسلم دنیا کے لئے ایک نیا اضافہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

ایک اور جامع اور بااثر ابلاغی ادارہ مڈل ایسٹ براڈکاسٹنگ سینٹر (Middle East Broadcasting Center) ہے۔ اس ادارے کا قیام ۱۹۹۱ء میں لندن میں ہوا۔ ۲۰۰۲ء میں اس کو دبئی منتقل کیا گیا۔ اس وقت اس ادارے کی نگرانی میں ۱۰ چینل کام کر رہے ہیں۔ ایم بی سی ۱، ایم بی سی ۲، ایم بی سی میکس، ایم بی سی ۳، ایم بی سی ۴، ایم بی سی ایکشن، ایم بی سی پریسیا، معروف ٹی وی چینل العربیہ، وناسہ (Wanasah)، ایم بی سی ڈرامہ وغیرہ، جبکہ دو ریڈیو اسٹیشن ایم بی سی ایف ایم اور پانورامہ ایف ایم (Panorama FM) بھی کام کر رہے ہیں۔

ان چینلوں میں سے صرف ایک چینل العربیہ خبریں فراہم کرتا ہے باقی تمام چینل (ٹی وی ہو یا ریڈیو) تفریحی اور موسیقی کے پروگرام نشریات کرتے ہیں۔ دو چینل ایم بی سی ۲ اور ایم بی سی میکس (MBC Max) میں چوبیسوں گھنٹے فلمیں نشر کی جاتی ہیں۔ ایک چینل بچوں کے معاملات پر پروگرام نشر کرتا ہے، جبکہ دیگر میں سے اکثر چینل اپنے ناظرین کو موسیقی کی دنیا سے باخبر رکھتے ہیں۔

ادارے کے مالکان نے عرب عوام کی خواہشات اور فکری میلان کو دیکھتے ہوئے آغاز سے ہی تفریحی پروگراموں کو فوقیت دے رکھی ہے جبکہ موسیقی کی نشریات بھی اس ادارے کی ترجیحات میں شامل ہیں۔ اپنے وجود سے لے کر اب تک اس ادارے نے مسلسل ترقی برقرار رکھی ہے۔ اب تک پوری دنیا میں ۱۵۰ ملین کے قریب لوگ اس ادارے کے تحت چلنے والے چینلوں کے ناظرین میں شامل ہوتے ہیں۔

دیگر چند ایک معروف میڈیا اداروں میں العَالم ٹی وی، نیل ٹی وی، المنار ٹی وی اور اخبار خلیج ٹائمز شامل ہیں۔ یہ ادارے اندورن ملک رونما ہونے والے واقعات پر گہری نظر رکھنے کے علاوہ بین الاقوامی حالات کی بھی بھرپور تشہیر کرتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ادارے مسلمان اقوام کو حالاتِ حاضرہ سے ہم آہنگی کرنے کی ہر ممکن سعی کرتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں بھی ابلاغی اداروں کی ایک طویل فہرست ہے تاہم ان میں سے کسی ایک کی حیثیت بین الاقوامی سطح کی نہیں ہے۔ ہمارے اس دعویٰ کی حقیقت یوں ثابت ہوتی ہے کہ ان اداروں

میں سے کوئی ایک بھی بین الاقوامی نوعیت کی معلومات کو زیادہ وقت نہیں دیتا۔ چوبیس گھنٹے کی نشریات کے دوران عوام کو ایک منٹ سے کم وقت میں عالمی حالات سے باخبر رکھنے کی روایت عام ہے۔

حالانکہ بین الاقوامی اہمیت کے حامل نشریاتی ادارے ایک چھوٹے سے ملک سے منسوب واقعہ کو نظرانداز نہیں کرتے، لیکن مسلمان ملکوں خاص طور پر پاکستان کے نشریاتی ادارے اس اہمیت سے آگاہ نہیں یا آگاہ ہونا نہیں چاہتے لہٰذا ان اداروں میں بیرون دنیا سے جڑے واقعات کی تشہیر بہت ہی کم ہوتی ہے۔ البتہ اندورنی طور پر ہندوستان اور پاکستان میں چند ایک ادارے ہیں جن کی مقبولیت دیگر میڈیا اداروں سے زیادہ ہے۔ جیسے زی سلام (ہندوستان)، پیس ٹی وی (ہندوستان) اور جیوٹی وی نیٹ ورک (پاکستان)، یہ تینوں ادارے مسلمانوں کی زیر ملکیت ہیں اور ان کی نشریات دنیا کے دیگر میڈیا اداروں کی طرح تبلیغ (بشمول مختلف پروگرام)، خبریت، تفریح اور فلموں کی تشہیر پر مشتمل ہوتی ہیں۔

لیکن پیس ٹی وی جو کہ معروف ہندوستانی دانشور ڈاکٹر عبدالکریم ذاکر نائیک کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔ یہ ایک سیٹیلائٹ چینل ہے جو دبئی سے نشر کیا جاتا ہے۔ اس میں (اپنے فہم اسلام کے مطابق) مذہبِ اسلام اور مسلم تہذیب وثقافت سے متعلق پروگرام پیش کئے جاتے ہیں۔ (11)

پاکستان کے معروف ٹی وی نیٹ ورک ''جیونیوز'' کا قیام ۲۰۰۲ء میں ہوا۔ اپنے قیام سے لے کر اب تک اس نیٹ ورک نے کئی نئے چینل قائم کئے ہیں۔ جیونیوز، جیو، جیو تیز، جیوسُپر، آگ اور کہانی جیسے چینلوں کا قیام اس بات کی نشاندہی ہے کہ جیوٹی وی نیٹ ورک نے زندگی کے ہر شعبے کو عوام کے سامنے رکھنے کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ جبکہ دیگر معروف چینلوں میں ایکسپریس نیوز، اے آر وائی، آج ٹی وی، دنیا ٹی وی، کیپٹل ٹی وی، وقت وغیرہ شامل ہیں۔

پاکستان میں مذہبی چینلوں کی تعداد بہت کم ہے۔ مخصوص نظریات کی تشہیر کے سبب ان کا دائرہ کار شروع سے ہی محدود رہا ہے۔ اگرچہ ان چینلوں کی نسبت اسلام کی ترویج و تبلیغ کی طرف دی جاتی ہے تاہم یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ ان چینلوں کا رجحان مسلک کی طرف زیادہ ہے اور وہ اسلام کی عمومی ترجمانی کے بجائے مسلکی ترجمانی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ گویا مسلکی و مذہبی چینلوں کے اجراء کے

پس پردہ اُس مسلک و مذہب کی تبلیغ و ترویج ہوتی ہے۔ جبکہ فریقِ مخالف کے خلاف پروپیگنڈہ بھی ان کے مطمع نظر ہوتا ہے۔

بطور مثال ہم ایران اور سعودی عرب کے بعض اسلامی چینلوں کی طرف اشارہ کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں ممالک چونکہ اسلام کے دو بڑے متاثر کن مسلک کی نمائندگی کرتے ہیں لہٰذا ان کے ہاں رائج نظامِ زندگی میں مسلکی رنگ کا نمایاں ہونا ایک فطری عمل ہے۔ اسی تناظر میں جب ہم میڈیائی شعبے کی طرف دیکھتے ہیں تو جہاں ان دونوں ممالک میں رائج اخبارات، رسائل، جرائد اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینل اپنے مسلک کے بارے میں رطب اللسان نظر آتے ہیں وہی مسلکِ مخالف کی کوتاہیوں کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔

مذہبی چینلوں کی کم مقبولیت اور ان کے ناظرین میں کمی کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ بعض حلقوں (12) میں ابلاغ کے جدید ذرائع خاص طور پر ٹیلی ویژن کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ درج بالا مسلم ممالک کے میڈیا ادارے قطعی طور پر دوسری اقوام خاص کر مغربی ذرائع ابلاغ سے مسابقت نہیں رکھتے اور نہ ہی ان اداروں کی طرح تحقیقی و استخراجی خبریں نشر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ البتہ چند ایک واقعات (13) نے مسلم ممالک میں رائج ذرائع ابلاغ کو میڈیا وار مسابقتی عمل کی طرف ضرور متوجہ کیا ہے۔

سطور بالا میں ذکر کیا گیا کہ اس وقت مسلمان ممالک کے پاس عالمی سطح کا کوئی ایک نشریاتی ادارہ نہیں ہے جس کی مقبولیت دیگر نشریاتی اداروں کے برابر قرار دی جا سکے۔ جبکہ مسلمانوں کے ہاں رائج نشریاتی اداروں سے زیادہ مقبول، جدید اور سریع الاثر ادارے دیگر اقوام کے پاس ہیں جن کی اجمالی تفصیل کچھ یوں ہے:

دنیا کی بڑی خبر رساں ایجنسیز جیسے رائٹر، یونائیٹڈ پریس، فرانسیسی نیوز ایجنسی اور ایسوسی ایڈ پریس مغربی ممالک کی ملکیت ہیں جبکہ میڈیا (ذرائع ابلاغ) کی پانچ بڑی کمپنیاں والٹ ڈزنی، ٹائم وارنر، وایا کام پیراماؤنٹ، نیوز کارپوریشن اور سونی جیسی کمپنیاں بھی مسلم اُمہ کی نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کمپنی کی زیر ملکیت کئی کئی ٹیلی ویژن اور ریڈیو چینلز کام کرتے ہیں۔ اب ہم ان میں سے ہر ایک کمپنی سے وابستہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو چینلز کی تعداد بیان کرتے ہیں:

(ا) ....والٹ ڈزنی کے پاس تین بڑے ٹیلی ویژن چینلز ہیں۔ اے بی سی دنیا میں سب سے زیادہ دیکھا جانے والا کیبل نیٹ ورک ہے۔ صرف امریکہ کے اندر اس کیبل نیٹ ورک کے ایک کروڑ چالیس

لاکھ کنکشن ہولڈرز ہیں۔ یہ کمپنی دو ریڈیو پروڈکشن کمپنیوں، فلمیں بنانے والی دنیا کی تین بڑی کمپنیوں، آرٹ کے دو ٹیلی ویژن چینلز، گیارہ اے ایم ریڈیو اور ایف ایم ریڈیو چینلز کی مالک ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ دیکھا جانے والا اسپورٹس چینل ای ایس پی این بھی اس کمپنی کی ملکیت ہے۔ دنیا کے ۲۲۵ ٹیلی ویژن چینلز اور ۳۴۰۰ ریڈیو چینلز والٹ ڈزنی سے وابستہ ہیں۔ یہ کمپنی دنیا کی بڑی کارٹون فلمیں بنانے میں بھی مشہور ہے۔

(۲) .... ٹائم وارنر کیبل پر دنیا میں سب سے زیادہ دیکھا جانے والا فلموں کا چینل ایچ بی او، میوزک کا سب سے زیادہ دیکھا جانے والا چینل وارنر میوزک، اور ریڈیو پروڈکشن کمپنی اور دنیا کے پانچ کثیر الاشاعت میگزین ٹائم، اسپورٹس، السٹریٹڈ، پیپل اور فارچون ہیں۔

(۳).... وایاکام پیراماونٹ کے اہم چینلوں میں ایم ٹی وی اور نک کیلوٹن شامل ہیں۔ اس کے پاس ریڈیو کے ۱۲، ٹیلی ویژن کے ۱۳ چینلز ہیں، یہی کتابیں شائع کرنیوالے تین بڑے اداروں اور ایک فلم ساز ادارے کی بھی مالک ہے۔

(۴).... نیوز کارپوریشن بھی بے شمار ٹی وی چینلز اور رسائل کی مالک ہے۔

(۵).... سونی کمپنی فلمیں بھی بناتی ہیں جبکہ اس کے پاس ٹیلی ویژن اور ریڈیو چینلز کی اچھی خاصی تعداد بھی ہے۔ اس کے علاوہ مطبوعہ ابلاغ میں اغیار کی تیز رفتار بھی قابل دید ہے۔ مشہور اشاعتی ادارہ نیوہاؤس کے تحت ۲۶ روزنامے اور ۲۴ میگزین شائع ہوتے ہیں جبکہ دنیا کے مشہور اخبارات وال اسٹریٹ جرنل، نیویارک ڈیلی نیوز، نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ، فنانشل ٹائمز، دی گارڈین اور میگزین میں ریڈرز ڈائجسٹ، ٹائمز میگزین، پلے بوائے، بزنس ویک وغیرہ بھی غیر مسلم اقوام کے سریع الاثر ذرائع ابلاغ ہیں اور اس وقت عالمی سطح پر سب سے زیادہ پسند کئے جانے والے ٹی وی اور ریڈیو چینلز، اخبارات اور میگزین نہ صرف مسلمانوں کی ملکیت نہیں ہیں بلکہ مسلم اُمہ کی اکثریت انہی ذرائع ابلاغ پر انحصار کرتی ہے۔ (14)

اسی طرح سوشل میڈیا کے تمام ذرائع بھی دنیا کی ترقی یافتہ اقوام (مغرب) کے پاس ہیں۔ فیس بک اور ٹوئیٹر جیسے ابلاغی ذرائع کا استعمال آج دنیا کے تقریباً ہر ملک میں ہوتا ہے اور ان کے موجد کار مغربی ممالک ہی ہیں اور یہی ذریعہ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ باثر اور زیادہ استعمال ہونے والا آلہ ہے۔ مغرب

جو اس کا موجد بھی ہے، نے اس شعبہ کو زیادہ تر تجارتی مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے تاہم اسلام اور شعائر اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کے لئے بھی اس کو استعمال کرنا عام سے بات بن گئی ہے۔ البتہ مسلمان ریاستوں میں اس کا استعمال تبلیغی و تبدیلی امور کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے اور کیا گیا ہے۔

۲۰۱۰ء کے دوران عرب دنیا میں آنے والے انقلابات کے پس پردہ سماجی میڈیا کا بڑا کلیدی کردار تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم مملکتوں میں جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال کس قدر بڑھ گیا ہے۔ خاص طور پر مصری انقلاب کے تمام تانے بانے سوشل میڈیا سے ہی جڑے ہوئے ہیں۔ چند نوجوانوں نے عزم مصمم کے بل بوتے پر پوری مصری قوم کو ایک ڈکٹیٹر کے خلاف متحد کیا اور فیس بک جو روز مرہ کی مصروفیات کی ترسیل کا باعث تھا اس کو انقلابی تبدیلی کا ذریعہ بنادیا۔ دنیا میں فیس بک کے استعمال کنندگان کی سب سے زیادہ تعداد (۱۴ کروڑ ۹۴ لاکھ ۶۱ ہزار ۶۴۰) امریکہ میں جبکہ حیرت انگیز طور پر دوسرے نمبر پر مسلم ملک انڈونیشیاء ہے جہاں ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ ۱۱ ہزار ۹۴۰ افراد فیس بک استعمال کرتے ہیں۔ دنیا کے دس بڑے ممالک جہاں فیس بک (سوشل میڈیا) سب سے زیادہ استعمال کیا جاتا ہے میں سے دو مسلمان ملک ہیں ایک انڈونیشیاء جس کا ذکر سطور بالا میں ہوا جبکہ دوسرا ترکی ہے جہاں پر ۲ کروڑ ۵۴ لاکھ ۲۰ ہزار ۴۰۰ افراد فیس بک سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ (15)

یہاں پر ایک تلخ حقیقت کا ذکر کرنا مناسب رہے گا کہ مسلمانوں نے ذرائع ابلاغ سے استفادہ اور ایجاد کے سلسلے میں اب تک تقلیدی رویہ اپنا رکھا ہے۔ افریقہ سے لے کر جنوبی ایشیاء تک اور ایشیاء سے لے کر مغرب اور براعظم آسٹریلیا تک مسلمانوں کی اکثریت ان ذرائع ابلاغ سے وہی کام لیتی ہے جو دنیا کی دوسری اقوام لیتی ہیں۔ اس عمل سے ایک طرف ذرائع ابلاغ کی عمومیت ظاہر ہوتی ہے وہی دوسری طرف اقوام عالم میں اس کے بڑھتے ہوئے اثرات واضح دیکھائی دیتے ہیں۔ یہاں پر اسلامی ریاست کا امتحان ہے کہ وہ ذرائع ابلاغ کی عمومیت کو پیش نظر رکھنے کی بجائے اس کی خصوصیت کو استفادہ میں لائے۔

خلاصہ بحث کے طور پر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مسلمان ملکوں میں ذرائع ابلاغ کی نوعیت اور ہیئت وہی ہے جو دنیا کے کسی دوسرے ملک میں ہے۔ عملاً مسلم ریاستوں میں رائج ذرائع ابلاغ خاص طور پر نشریاتی ادارے اور انٹرنیٹ (جالبین) جیسے سریع الحرکت ذرائع غیر مسلم ممالک (مغرب) سے مستعار

لئے گئے ہیں۔ لہٰذا اس بات کا دعویٰ کہ مسلمان ریاستوں میں ذرائع ابلاغ کی نوعیت اور ہیئت منفرد قسم کی ہے، ایک مفروضے کے سوا کچھ نہیں۔ البتہ ایک اسلامی ریاست میں جدید ذرائع ابلاغ سے استفادہ کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے۔ کچھ شرائط و قیود کے ساتھ ان کا دائرہ کار محدود کیا جاسکتا ہے یا ان کو مزید بہتری کی طرف لے جایا جاسکتا ہے، تاکہ اسلامی تعلیمات کی تبلیغ بہتر انداز میں اور وسیع پیمانے پر ہو سکے۔

*****

حوالہ جات

1۔ابن کثیر، حافظ عمادالدین ابن عمر، البدایۃ والنھایۃ، مرکز البحوث والدراسات العربیہ والاسلامیہ بدارِ ھجر، ۱۴۱۷ھ بمطابق ۱۹۹۷ء ج ۴، ص : ۹۳, الریاض

2۔قرطبیؒ، ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری، تفسیر قرطبیؒ، ج ۲، ص: ۱۲۱

3۔ www.wikipedia.com/Retrieved on 22 October 2013

4۔الجوزیہ، ابی عبداللہ شمس الدین محمد بن ابی بکر، المیلاد النبی ﷺ، محولہ بالا، ص: ۵۸

5۔شافعی، ابن حجر، فتاویٰ حدیثیہ، ص: ۱۲۹

6۔القسطلانی، العلامۃ أحمد بن محمد، المواھب اللدنیہ بالمنح المحمدیۃ، المکتب الاسلامی، ۱۴۲۵ھ بمطابق ۲۰۰۴ء، ج ۱، ص: ۲۷, بیروت

7۔احمد بن محمد بن حنبل، المسند، (مترجم: مولانا محمد ظفر اقبال)، مکتبہ رحمانیہ، حدیث: ۱۲۴۲۹، س ن، ج ۷، ص: ۴۲۲، لاہور

8۔Khalid hasan, little done to reform education in Pakistan, says us report, Daily Times, Karachi, and Pg: 7, dated 92.11.2004 . http://www.dailytimes.com

9۔عبدالرضا آل کاشف الغطاء النجفی ، الانوار الحسینیہ والشعائر الاسلامیہ، طبعہ بمبئی سنہ 1346ھ، ص: ۴۲

10۔http://www.thesocialmediaguide.com

11۔www.peacetv.com

12۔ دیوبند مکتب فکر کے بعض علماء جدید ذرائع ابلاغ (ٹی وی چینلز) کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ان کی نظر میں ٹی وی ایک آلہ لہوولعب اور سراسر نجس ہے۔ (مولانا محمد یوسف لدھیانوی، تصویر اور سی ڈی کے شرعی احکام، ص: ۱۲۶-۱۲۷) ان کا خیال ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کے مکلّف نہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو لوگوں کو پکا مسلمان بنا کر چھوڑیں۔ بلکہ جائز ذرائع سے اسلام کی تبلیغ کی جاسکتی ہے۔ (مفتی تقی عثمانی، نقوش رفتگان، ص: ۱۰۵، ۱۰۴) البتہ دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کورنگی کراچی کے علماء جدید ذرائع ابلاغ کے فی نفسہ استعمال کو جائز سمجھتے ہیں۔ (بحوالہ: راقم کے استفتاء پر دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کورنگی کراچی کا فتویٰ، بتاریخ ۷ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ بمطابق ۲۰ نومبر ۲۰۱۳ء، فتویٰ نمبر ۹۸/۱۵۷۳)

13۔ گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کا آغاز ۲۰۰۹ء میں ہوا جب سویڈن کے اخبار کے ایک ایڈیٹر نے پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے کی جسارت کی۔ مسلمانوں کی طرف سے شدید ردِ عمل کے نتیجے میں متمدن تہذیب کے دعویدار طبقات بجائے اس کی مذمت کرتے، الٹا اظہارِ رائے کی آزادی کے نام پر متعلقہ اخبار اور اس کے ایڈیٹر کی حمایت کی، نہ صرف اس اقدام کو قابل مذمت نہیں جانا گیا بلکہ دیگر اخبار نے بھی یکجہتی کے لئے گستاخانہ خاکے شائع کئے، جن میں فرانس سرفہرست ہے جہاں ۱۹ ستمبر ۲۰۱۲ء میں ایک مقامی میگزین کی انتظامیہ نے یہ اوچھی حرکت کی جبکہ ڈنمارک سمیت متعدد یورپی ممالک نے اس ناشائستہ حرکت کا ارتکاب کیا۔ جبکہ اسی دوران کچھ فلمیں اس سلسلے میں بنائی گئیں جن کا مقصد کلی طور پر ایک مذہب کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا تھا۔ ان گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کے بعد اگرچہ مسلم ریاستوں کے ذرائع ابلاغ بھرپور فعالیت کا مظاہرہ نہ کرسکے تاہم یہ عدم التفات کا شکار بھی نہ رہے۔ مسلم اُمہ کی طرح ذرائع ابلاغ نے بھی نحیف سی آواز میں احتجاج ضرور کیا۔ یہ جواب ایک طرح سے مسلمان ذرائع ابلاغ کا جذباتی اور فطری ردِ عمل تھا وہی دوسری جانب مسلمان ذرائع ابلاغ اپنی مسابقت کا آغاز بھی کر رہے تھے۔

14۔ مغربی میڈیا اور اس کے اثرات، ص: ۱۱۳

◉Time Warner Cable Reports 2012 Fourth-Quarter and Full-Year Results. Retrieved May 17, 2013.

◉ "Global 500 2009: Industry". CNN. July 20, 2009. Retrieved May 1, 2010.

◉Media Companies Blast YouTube for Anti-Piracy Policy. Foxnews.com (February 19, 2007). Retrieved July 13, 2011.

15۔ عابد، عبیداللہ، "فیس بک کے مصری ہیرو"، مشمولہ: ایکسپریس سنڈے میگزین (کراچی)، ۲۰ فروری ۲۰۱۱ء، ص: ۷

صدر اسلام میں مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات پر ایک نظر

ڈاکٹر محمد افضل*
dr.muhammadafzalkarimi@gmail.com

کلیدی کلمات: ہجرت مدینہ ،میثاق مدینہ ، یہودی قبائل، یہودیوں کی پیمان شکنی

خلاصہ

ہجرت کے بعد آنحضرتؐ نے نئی ریاست کے استحکام کے لیے مختلف قبائل کے ساتھ تعلقات کو نئی جہت دی۔ اور میثاق مدینہ کے بعد مدینہ میں بااثر یہودی قبائل کے ساتھ بھی الگ معاہدہ کیا، چونکہ ان قبائل کا اثر مختلف ابعاد میں نمایاں تھا۔ اگر ابتدا ہی میں آپؐ کے ان یہودی قبائل کے ساتھ تعلقات خراب ہو جاتے تو مسلمان مشکل میں پڑ جاتے،اس کے باوجود جلد ہی مسلمانوں کے یہودیوں کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اس دوران کچھ ایسے واقعات بھی پیش آئے جن کی وجہ سے کچھ محققین کے ذہنوں میں شبہات پیدا ہو رہے ہیں، جن کا تسلی بخش جواب دینا ضروری ہے۔ یہ بھی مدّ نظر رہے کہ موجودہ دور میں اس موضوع کی کیا اہمیت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات جیسا حساس موضوع اگر اسلامی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کے لئے جب تک اسلام کے دو بنیادی مصادر قرآن اور سیرت طیبہ کو نہیں دیکھا جائے گا اس وقت تک مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تعلقات کی صحیح تصویر سامنے نہیں آئے گی۔

*۔ علوم اسلامی جامعہ کراچی

مقدمہ

مسلمانوں کی مدینہ کی طرف ہجرت اور مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد رسول اللہ ﷺ نے نئی قائم شدہ ریاست کے استحکام کے لیے مختلف قبائل اور ادیان کے ساتھ تعلقات کو پیش آمدہ صورتحال کے مطابق نئی جہت دی۔اسی تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے میثاق مدینہ کے بعد مدینہ میں فعال اور بااثر تین یہودی قبائل (بنی قینقاع، بنی قریظہ، بنی نضیر)کے ساتھ بھی الگ معاہدہ کیا چونکہ دوسرے چھوٹے یہودی قبائل کے مقابلے میں مدینہ میں ان تین قبائل کا اثر مختلف ابعاد میں نمایاں تھا اور ان کی اہمیت اور ضرورت سے چشم پوشی کرنا ناممکن تھا۔

اسی بنا پر ان کے ساتھ بہتر تعلقات کے قیام کو اہمیت دی۔ اگر ابتدا ہی میں رسول اللہ ﷺ کے ان یہودی قبائل کے ساتھ تعلقات خراب ہو جاتے تو مسلمانوں کو انتہائی مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑتا یہی اہم وجہ تھی کہ صدر اسلام کے مسلمانوں نے ان کے ساتھ ممکنہ حد تک تعلقات بہتر بنانے کی سعی کی مگر بہت کم عرصے میں ان کے یہودی قبائل کے ساتھ تعلقات کشیدگی کی انتہا تک پہنچ گئے اور اس دوران کچھ ایسے واقعات بھی پیش آئے جن کی وجہ سے جدید دور کے محققین کے ذہنوں میں شکوک اور شبہات پیدا ہو رہے ہیں جن کا تسلی بخش جواب تلاش کرنے کی ضرورت ہے اور اس موضوع کے حوالے سے اس بات کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے کہ موجودہ دور میں اس موضوع کی کیا اہمیت اور ضرورت ہے؟

اس سوال کا اجمالی جواب کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ موجودہ دور میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تعلقات جیسے حساس موضوع کو اگر اسلام کے نقطہ نگاہ سے زیر بحث لایا جائے تو اس موضوع کا دارومدار قرآن اور سیرت طیبہ پر ہوگا چونکہ یہ دونوں اسلام کے بنیادی مصادر میں سے شمار ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب تک رسول اللہ ﷺ کے یہودیوں کے ساتھ برتاؤ کو محققانہ انداز میں زیر بحث نہیں لایا جائے گا اس وقت تک آج کے دور میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تعلقات کی صحیح تصویر ہمارے سامنے نہیں آئے گی۔ زیر نظر موضوع کو اسی ضرورت کے تحت مورد بحث قرار دیا گیا ہے اور موضوع کی مزید

وضاحت کے لئے ماضی کے چند نمایاں گوشے جو مسلمانوں اور یہودیوں کے معاشرتی حالات کا احاطہ کرتے ہیں، بھی بیان کئے گئے ہیں۔

یہودیوں کی مدینہ آمد

سرزمین حجاز کے یہودیوں کی تاریخ اور ان کی ہجرت کے بارے میں مورخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے چونکہ عرب کے یہودیوں کی کوئی مستند تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے۔ انہوں نے خود اپنی کوئی ایسی تحریر کسی کتاب یا کتبے کی شکل میں نہیں چھوڑی ہے، جس سے ان کے ماضی پر روشنی پڑسکے اور عرب کے باہر کے یہودی مورخین اور مصنفین نے ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جزیرۃ العرب میں آکر وہ اپنے بقیہ ملت سے بچھڑ گئے تھے اور دنیا کے یہودی سرے سے ان کو اپنوں میں شمار ہی نہیں کرتے تھے کیونکہ انہوں نے عبرانی تہذیب اور زبان حتی کہ نام تک چھوڑ کر عربیت اختیار کرلی تھی۔(1)

حجاز کے یہودیوں کے بارے میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ سب سے پہلے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخری عہد میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے اس کی وجہ بعض مورخین نے کچھ اس طرح بیان کی ہے کہ حجاز کے پہلے باشندوں میں سے عمالیق نام کا ایک قبیلہ تھا جو لوگوں پر بہت ظلم کرتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک لشکر یثرب کے علاقے سے عمالیق کو نکالنے کے لئے بھیجا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ اس قوم کے کسی شخص کو بھی زندہ نہ چھوڑیں۔ بنی اسرائیل کے اس لشکر نے یہاں آکر فرمان نبی کی تعمیل کی مگر عمالقہ کے بادشاہ کا ایک لڑکا بڑا خوبصورت جوان تھا اسے انہوں نے زندہ رہنے دیا اور اس کو ساتھ لیے ہوئے فلسطین واپس پہنچے۔

اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہو چکا تھا ان کے جانشینوں نے اس بات پر سخت اعتراض کیا کہ ایک عمالیقی کو زندہ چھوڑ دینا شریعت موسوی کے احکام کی صریح خلاف ورزی ہے اس بنا پر انہوں نے اس لشکر کو اپنی جماعت سے خارج کر دیا اور اسے مجبوراً یثرب آکر بسنا پڑا۔(2) یہ قصہ تاریخی منابع میں کافی شہرت رکھتا ہے، لیکن اس کے باوجود بعض مصنفین اس واقعہ کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔(3) حجاز کی طرف یہودیوں کی ہجرت کی دوسری وجہ جو بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ جب رومیوں نے شام پر قبضہ کر

کے یہودیوں کا قتل عام کیا اور انہیں سرزمین فلسطین سے نکال باہر کیا تو اس دور میں بہت سے یہودی قبائل بھاگ کر حجاز میں پناہ گزین ہوگئے تھے (4)

دوسری طرف کچھ مورخین یہودیوں کی ہجرت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ۵۸۷ق.م میں جب بابل کے بادشاہ بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کرکے یہودیوں کو دنیا بھر میں تتر بتر کر دیا تو اس زمانے میں یہودیوں کے متعدد قبائل وادی قریٰ، تیما، اور یثرب میں آ کر آباد ہوگئے تھے۔ (5) اس کے علاوہ ایک اور وجہ بیان کی گئی ہے، جس کے بارے میں ایک روایت بھی ہے کہ یہودیوں نے اپنی کتابوں میں پڑھا تھا کہ حضرت محمدؐ جس جگہ ہجرت کرکے رہیں گے وہ عیر اور احد کے پہاڑوں کے درمیان کوئی جگہ ہوگی، انہی دو پہاڑوں کی جستجو میں وہ نکل گئے یہاں تک کہ انہیں پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے اور وہی سکونت اختیار کرلی۔ (6)

اس روایت کا سورہ بقرہ کی ۸۹ آیت کے ساتھ جب موازنہ کیا جاتا ہے تو یہ ایک قابل اعتبار دلیل کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی قرآن میں بہت ساری ایسی آیات موجود ہیں جہاں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہودیوں کو حضرت محمد ﷺ کے بارے میں شناخت حاصل تھی۔ (7)

مسلمانوں کی یثرب کی طرف ہجرت سے پہلے یہودیوں کے جو قبائل اس شہر میں زندگی گزار رہے تھے، ان میں مشہور ترین یہودی قبایل بنی نضیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع بھی شامل تھے۔ یہ تینوں قبائل مدینہ میں موجود یہودیوں کے مشہور قبیلے تھے ان کی تاریخ میں شہرت حاصل کرنے کی ایک وجہ مسلمانوں کے ساتھ انکے خراب اور کشیدہ تعلقات بھی ہیں۔ یہ تینوں قبائل قبا کے شمال مشرق کی جانب رہ رہے تھے۔ ان کی وجہ تسمیہ بعض اس طرح بیان کرتے ہیں کہ بنی نظیر اور بنی قریظہ کوہ نضیر اور کوہ قریظہ کے اطراف میں رہنے کی وجہ سے انہیں نظیر اور قریظہ کہا جانے لگا۔ (8) اس کے علاوہ کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ جس وقت بنی نضیر، بنی قریظہ اور بنی بہدل نے سرزمین حجاز میں قدم رکھا تو شروع میں غابہ (شمال یثرب) رہنے لگے جب وہاں کسی بیماری کی وبا پھوٹنے لگی تو یثرب چلے گئے بنی نضیر "بطحان" میں اور بنی قریظہ "مہروز میں سکونت اختیار کرنے لگے۔" (9)

مدینہ میں یہودیوں کی مجموعی حالت:

مدینہ میں اور پورے جزیرۃالعرب میں رہنے والے یہودیوں نے زبان، لباس، تہذیب، تمدن کے لحاظ سے پوری عربیت کا رنگ اختیار کر لیا تھا حتی کہ ان کی غالب اکثریت کے نام تک عربی ہوگئے تھے بارہ یہودی قبایل جو حجاز میں آباد ہوئے تھے ان میں سے بنی زعوراکے سوا کسی قبیلے کا نام عبرانی نہ تھاان کے چند گنے چنے علماکے سوا کوئی عبرانی جانتاتک نہ تھا،زمانہ جاہلیت کے یہودی شاعروں کا جو کلام ہمیں ملتا ہے اس کی زبان اور خیالات اور مضامین میں شعرائے عرب سے الگ کوئی امتیازی اسلوب جس سے ان کے درمیان فرق معلوم ہو، نہیں ملتا ہے اس کے علاوہ ان کے اور عربوں کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات بھی قائم ہوچکے تھے۔

اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو ان میں اور عام عربوں میں دین کے سوا کوئی فرق باقی نہ رہا تھا لیکن ان ساری باتوں کے باوجود وہ عربوں میں جذب بالکل نہ ہوئے تھے اور انہوں نے شدت کے ساتھ اپنی یہودی عصبیت برقرار رکھی تھی۔(10) یثرب میں یہودی بارہ سو سال تک بلا شرکت غیر حاکم بنے رہے اس پورے علاقے میں انہیں کا سکہ چلتا تھاحالانکہ یثرب میں عرب قبایل بھی ان کے ساتھ رہ رہے تھے مگر ان کے اندر اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ یہودیوں کے مقابلے پر اتر آتے۔جب سدّمارب کا تباہ کن سیلاب آیا تو اس علاقے کے رہنے والے مختلف علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے ان میں سے غساسنہ شام کی طرف اور اوس وخزرج یثرب کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔

سیاسی اعتبار سے اوس،خزرج کا مدینہ آنا یہودیوں کیلے خطرے کی گھنٹی تھی مگر یہودیوں نے خود کو اتنا مستحکم کر لیا تھا کہ اوس و خزرج کو ششیں کرنے کے باوجود یہودیوں کی طاقت کے سامنے بے بس رہے۔(11) اقتصادی طور پر یہودیوں کی حالت دوسرے عرب قبایل کی نسبت زیادہ مضبوط تھی کیونکہ وہ فلسطین اور شام کے زیادہ متمدن علاقوں سے آئے ہوئے تھے، اس لیے وہ بہت سے ایسے فنون جانتے تھے جو اہل عرب میں رائج نہ تھےاور باہر کی دنیا سے ان کے کاروباری تعلقات بھی تھے۔

اس بنا پر یثرب اور بالائی حجاز میں غلے کی درآمد اور یہاں سے چھوہاروں کی برآمد ان کے ہاتھ میں آ گئی تھی، مرغبانی اور ماہی گیری پر بھی زیادہ تر ان ہی کا قبضہ تھا، پارچہ بافی کا کام بھی ان کے ہاں ہوتا تھا جگہ جگہ میخانے بھی انہوں نے قائم کر رکھے تھے، جہاں شام سے شراب لا کر فروخت کی جاتی تھی بنی قینقاع زیادہ تر سنار لوہار اور ظروف سازی کا پیشہ کرتے تھے۔ (12)

ہجرت مدینہ اور دونوں مذاہب کے تعلقات

مکہ میں مسلمانوں کیلے رہنا جب مشکل ہوا تو مسلمانوں نے ۶۲۲ء کو مکہ سے ۲۴۰ میل دور شمال میں واقع یثرب کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ جس کے بعد مسلمانوں کو یثرب میں (جس کا نام بعد میں مدینہ الرسولؐ پڑ گیا) پہلا اسلامی معاشرے کے قیام کا موقع مل گیا۔ مسلمان اپنی تاریخ کی پہلی حکومت قائم کرنے کے بعد اس شہر کے حالات میں بہتری لانے کے لیے اور حکومت کے استحکام کے لیے یہودیوں کے تعاون کے طالب تھے،اس لیے سیاسی طور پر مسلمانوں کی اس نئ حکومت کیلے یہ ضروری تھا کہ مدینہ کے بااثر یہودیوں کے ساتھ تعلقات میں بہتری پیدا ہو جائے۔ جبکہ یہودی بھی اپنے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھے اسی لیے نئ قائم حکومت کے سربراہ حضرت محمد ﷺ نے یہودیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا اور یہودیوں نے بھی مثبت جواب دیا۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ اور یہودیوں نے ایک بہتر دور کا آغاز کرنے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ظاہراً ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ ہوگئے اسی سلسلے میں بعد میں کچھ معاہدے بھی عمل میں آئے۔ مورخین نے مختلف مواقع پر ان کی طرف اشارے تو کیا ہے۔ مگر ان کے اصلی متن کو تحریر کرنے پر کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ان معاہدوں میں سے صرف دو اہم معاہدوں کا متن ہمیں تاریخ کی بعض کتابوں میں تحریری طور پر ملتا ہے ایک میثاق مدینہ دوسرا وہ معاہدہ جو حضرت محمد ﷺ کا یہودیوں کے تین معروف قبائل بنی نظیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع کے ساتھ عمل میں آیا تھا جن میں سے ایک عمومی معاہدے اور دوسرا خصوصی معاہدے کے نام سے معروف ہے۔

عمومی پیمان (میثاق مدینہ)

مسلمانوں کی مدینہ ہجرت کے بعد حضرت محمد ﷺ کے اقدامات میں سے ایک مہاجرین اور انصار کے درمیان عہد و پیمان باندھنا تھا جس میں یہودیوں کو بھی مورد توجہ قرار دیا گیا ہے۔ متاخر مورخین نے اس معاہدے کو حضرت محمد ﷺ کی نئی قائم کردہ اسلامی ریاست کا ایک شاہکار کارنامہ قرار دیا ہے جبکہ قدیم مورخین نے اس معاہدے کو خاطر خواہ اہمیت کا حامل نہیں سمجھا۔ یہاں تک کہ بہت سارے قدیم مورخین نے اس پیمان اور معاہدے کے متن کو نقل کرنے کی زحمت تک بھی نہیں کی ہے۔ صرف ابن ہشام نے اس اس پیمان کے متن کو ابن اسحاق سے روایت کرکے اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔ اسی طرح ابن ہشام کے ہم عصر ابو عبید نے بھی اپنی کتاب "الاموال" میں اس معاہدے کا متن تحریر کیا ہے۔(13) جبکہ معروف قدیم مورخین اور مصنیفن من جملہ ابن سعد، ابن خیاط بلاذری، یعقوبی، طبری نے اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے۔ اس پیمان کا متن انصار و مہاجرین کے داستان اخوت سے متعلق ہے جس میں ان دونوں قبائل کے حلیف یہودیوں کو بھی اس میں جگہ دی گئی ہے۔ اس معاہدے کے مکمل متن کی بجائے یہاں سیرہ ابن ہشام سے یہودیوں سے متعلق چند بندوں کو ذکر کیا جارہا ہے:

1) بنو عوف کے یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک ہی امت ہوں گے۔ یہود اپنے دین پر عمل کریں گے اور مسلمان اپنے دین پر۔ خود ان کا بھی یہی حق ہوگا اور ان کے غلاموں اور متعلقین کا بھی اور بنو عوف کے علاوہ دوسرے یہود کے بھی یہی حقوق ہوں گے۔
2) یہود اپنے اخراجات کے ذمہ دار ہوں گے اور مسلمان اپنے اخراجات کے۔
3) جو طاقت اس معاہدے کے کسی فریق سے جنگ کرے گی سب اس کے خلاف آپس میں تعاون کریں گے۔
4) اس معاہدے کے شرکاء کے باہمی تعلقات خیر خواہی، خیر اندیشی اور فائدہ رسانی کی بنیاد پر ہوں گے، گناہ پر نہیں۔
5) کوئی آدمی اپنے حلیف کی وجہ سے مجرم نہیں ٹھہرے گا۔
6) مظلوم کی مدد کی جائے گی۔

7) جب تک جنگ برپا رہے گی یہود بھی مسلمانوں کے ساتھ خرچ برداشت کریں گے۔
8) اس معاہدے کے سارے شرکاء پر مدینہ میں ہنگامہ آرائی اور کشت وخون حرام ہوگا۔
9) اس معاہدے کے فریقوں میں کوئی نئی بات یا جھگڑا پیدا ہو جائے جس میں فساد کا اندیشہ ہو تو اس کا فیصلہ اللہ عزوجل اور محمد رسول اللہؐ فرمائیں گے۔
10) قریش اور اس کے مددگاروں کو پناہ نہیں دی جائے گی۔
11) جو کوئی یثرب پر دھاوا بول دے، اس سے لڑنے کے لئے سب باہم تعاون کریں گے اور ہر فریق اپنے اپنے اطراف کا دفاع کرے گا۔
12) یہ معاہدہ کسی ظالم یا مجرم کے لئے آڑ نہ بنے گا۔(14)

جیسا کہ اس معاہدے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مہاجرین، انصار اور ان یہودیوں کے درمیان عمل میں آیا تھا جو ان دو قبیلوں سے وابستہ تھے گویا یہ وہی یہودی تھے جن کے بارے میں بعض مورخین کا کہنا ہے کہ اوس اور خزرج میں سے ایک گروہ نے یہودیوں کی ہمسائیگی کی بنا پر یہودیت اختیار کی تھی۔(15)اس گروہ کے اوس وخزرج سے تعلق رکھنے کی وجہ سے مسلمانوں سے تعلقات زیادہ کشیدہ نہیں تھے۔(16) یہ معاہدہ "موادعہ یہود" کے نام سے معروف ہے۔اس کی ایک بنیادی وجہ متھوّدین (یہودیت اختیار کرنے والوں) کی اس پیمان نامہ میں شرکت تھی۔

اگر اس قرارداد کا بغور جائزہ لیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس کو موادعہ یہود کہنا ہی غلط ہے۔ چونکہ اس قرارداد کے دونوں اطراف مہاجرین اور انصار تھے کسی بھی تاریخ نگار اور محقق نے یہ نہیں کہا ہے کہ یہ معاہدہ بنیادی طور پر مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان عمل میں آیا تھا۔چند یہودی گروہوں کے نام لینے اور ان کے بارے میں جو تذکرہ ہوا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ چونکہ یہ خود اوس اور خزرج سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے یہودیت اختیار کی تھی۔اب بھی ان کی وابستگی اوس وخزرج کے ساتھ اپنے ہم مذہب یہودیوں کی نسبت زیادہ تھی۔اس بنا پر بعض محققین کا کہنا ہے کہ میثاق مدینہ دراصل چند قراردادوں کا ایک مجموعہ ہے جس کو ابن اسحاق نے ایک پیمان کی شکل میں اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے۔(17)

بہر حال موادعہ یہود کے عنوان اور انصار کے یہودیوں کی اس پیمان نامہ میں شرکت سے بہت سے محققین اور مورخین یہ تصور کرنے لگے کہ اس میں یہود مدینہ کے تین معروف قبائل (قینقاع، نضیر، قریظہ) بھی شریک تھے۔اس قسم کے تصور کی جو بنیادی وجوہات سامنے آتی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

- محققین اور مورخین نے نے اس قرارداد (میثاق مدینہ) کو نقل کرتے وقت یہودیوں کے ان تین معروف قبائل کا نام بھی لیا ہے۔(18)
- تمام مورخین نے مسلمانوں اور یہودیوں کے ان تین معروف قبائل کی جنگ کے بارے میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کی مدینہ آمد کے بعد ان قبائل نے حضرت محمد ﷺ کے ساتھ معاہدہ کیا تھا چونکہ تاریخ کی قدیم کتابوں میں موادعہ یہود کے علاوہ کسی دوسرے پیمان نامے کا متن تحریر نہیں ہوا ہے۔ اس بناپر یہ تصور کرنے لگے کہ ان تینوں قبائل نے جو معاہدہ کیا تھا وہ وہی معاہدہ تھا جو میثاق مدینہ یا موادعہ یہود کے نام سے معروف ہے۔ حالانکہ اس بات پر اگر غور کیا جائے تو یہ درست نہیں ہے۔ان قبائل کا اس قرارداد سے کوئی تعلق ہے۔ان تینوں قبائل نے مسلمانوں سے الگ اور مخصوص معاہدہ کیا تھا۔ اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ یہ تینوں قبائل یہودیوں کے معروف ترین قبائل میں شمار ہوتے تھے اگر میثاق مدینہ میں یہ قبائل شریک ہوتے تو ان کا نام ضرور لیا جاتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ میثاق مدینہ میں یہودیوں کے آٹھ غیر معروف گروہوں کا نام تو لیا جاتا ہے جبکہ ان تینوں معروف اور بااثر یہودی قبائل کی طرف اشارہ بھی نہ ہو؟

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خود میثاق مدینہ کا متن اور مورخین نے جو کچھ ان تین یہودی قبائل کے بارے میں لکھا ہے ان کے درمیان کوئی ربط دیکھائی نہیں دیتا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ انہوں نے پیغمبر ﷺ کے ساتھ طے کیا تھا کہ یہ لوگ ہر صورت غیر جانب دار رہیں گے یہاں تک کہ مسلمانوں کے حق میں بھی وارد جنگ نہیں ہوں گے۔(19) جبکہ میثاق مدینہ کے متن میں واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ یہودی جنگی اخراجات میں سے کچھ اپنے ذمہ لیں گے۔مدینہ میں مسلمانوں نے جتنی جنگیں لڑی ہیں ان میں سے کسی جنگ کے بارے میں کسی مورخ نے نہیں لکھا ہے کہ یہودیوں کے ان تین قبائل نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ میں شرکت کی تھی۔

ان دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ میثاق مدینہ میں یہودیوں کے یہ تین قبائل شریک نہیں تھے۔ بعض مصنفین کچھ احتمالات کی بنیاد پر ان تین یہودی قبائل کی میثاق مدینہ میں شریک ہونے کے بارے میں مُصِرّ ہیں اور اس بارے میں لکھتے ہیں کہ: جب اوس خزرج سے وابستہ یہودی قبائل کو اس میثاق کا حصہ بنایا گیا ہے تو ممکن ہے کہ اوس خزرج کے حلیف ان قبائل کو بھی اس معاہدے کا حصہ بنایا گیا ہو۔(20) ایک معاصر محقق اس حوالے سے لکھتے ہیں: یہ واضح ہے کہ اس قرارداد میں یہودیوں سے مراد بنی قینقاع، بنی قریظہ اور بنو نضیر کے یہودی نہیں ہیں بلکہ یہ وہ یہودی ہیں جو انصارِ مدینہ کا حصہ تھے۔(21) ایک اور معاصر محقق کا بھی کہنا ہے کہ: میثاق مدینہ میں یہودیوں کے تین قبائل شریک نہیں تھے بعد میں ان کے اور حضرت محمد ﷺ کے درمیان ایک قرارداد عمل میں لائی گئی تھی۔(22)

یہودیوں کے تین معروف قبائل اور مسلمانوں کے درمیان معاہدہ

اس معاہدے کا متن علامہ طبرسی نے اپنی کتاب اعلام الوریٰ میں علی ابن ابراہیم سے نقل کیا ہے۔ اس قرارداد کے متن پر بھی میثاق مدینہ کے متن کی طرح مورخین نے توجہ نہیں دی ہے۔ یہ معاہدہ براہ راست مسلمانوں اور یہودیوں کے معروف بااثر اور نمائندہ قبائل کے درمیان ہوا تھا۔ جن کا مدینہ پر مسلمانوں کی ہجرت تک اقتصادی، سماجی اور مذہبی اعتبار سے اچھا خاصا اثر تھا اور اس بات سے مسلمان بھی بخوبی واقف تھے اسی بنا پر ان قبائل سے خصوصی معاہدہ کیا گیا تھا۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ دونوں معاہدوں میں طرفین نے معاہدے کے لئے قدم مذہبی عنصر سے زیادہ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر اٹھایا تھا۔

مسلمانوں کے لئے ضروری تھا کہ مدینہ میں قائم نئی حکومت کو استحکام حاصل ہونے کے ساتھ ان کے قدم مدینہ میں مضبوطی سے جمیں۔ ورنہ اگر مدینہ کے داخلی صورتحال خراب ہوتی تو قریش کی طرف سے لاحق خطرات عملی شکل اختیار کر سکتے تھے۔ جبکہ یہودی اس شہر کے قدیم باشندے ہونے کے ناطے اقتصادی اور سیاسی اور مذہبی مفادات رکھتے تھے وہ یہ چاہ رہے تھے کہ کسی نہ کسی طرح ان کے یہ مفادات خطرے میں نہ پڑ جائیں۔ بہر حال اس قرارداد کو ایک اہم ترین دستاویز قرار دی جاسکتی ہے جو مدینہ کے تین یہودی قبائل سے متعلق ہے، جس کو شیخ طبرسی نے نقل کیا ہے۔ اس معاہدے کا متن کچھ اس طرح ہے:

"قال علی بن ابراھیم بن ھاشم و جاء ته الیھود، قریظة والنضیر والقینقاع، ۔۔۔۔ و کان الذی ولی امر قریظة کعب بن اسد والذی تولیٰ امر بنی قینقاع مخیریق۔" (23)

یعنی: علی ابن ابراہیم نقل کرتے ہیں کہ بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع کے یہودی پیغمبر ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ لوگوں سے کیا بیان فرمارہے تھے۔ حضرت محمد ﷺ نے کہا کہ توحید اور میری رسالت پر گواہی دینے کے بارے میں بیان کررہا تھا۔ میں وہ ہوں جس کا نام توریت میں آیا ہے۔ تمہارے علما نے خود کہا تھا کہ میں مکہ میں ظہور کروں گا اور حرّہ (مدینہ) کی طرف ہجرت کروں گا۔ یہودیوں نے کہا کہ آپ نے جو کچھ کہا وہ ہم نے سنا۔ آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ آپ سے (اس شرط) پر صلح کریں کہ نہ آپ کے لئے مفید ثابت ہونگے اور نہ ہی نقصان دہ۔ آپ کے خلاف کسی کی مدد نہیں کریں گے اور آپ کے دوستوں کو اذیت نہیں دیں گے۔ آپ بھی ہمیں اور ہمارے دوستوں کو اذیت مت دو تاکہ ہم آپ اور آپ کی قوم کا آخری نتیجہ دیکھیں گے۔

پیغمبر ﷺ نے (ان کی پیش کش) کو قبول کیا اور ان کے ساتھ اس پیمان نامے پر دستخط کیا کہ مدینے کے یہودی پیغمبر ﷺ اور ان کے دوستوں کے خلاف زبان، ہاتھ، اسلحہ، سواری اور نہ ہی مخفی طور پر نہ ہی آشکارا، نہ رات کو اور نہ ہی دن کو کوئی بھی اقدام نہیں اٹھائیں گے۔ خداوند اس معاہدے پر گواہ رہے اگر یہودیوں نے ان شرائط کو نادیدہ لینے کی کوشش کی تو حضرت محمد ﷺ کو یہ حق حاصل ہوگا کہ انہیں قتل کریں۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو اسیر بنائیں اور ان کے اموال کو غنیمت کے طور پر لے لیں۔ اس پیمان نامے پر بنی نضیر کی طرف سے حیی بن اخطب نے (جبکہ) بنی قریظہ کی طرف سے کعب ابن اسد نے اور بنی قینقاع کی طرف سے مخیرّیق نے دستخط کیئے۔

قرارداد کے متن سے ہی بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اس کی اہمیت میثاق مدینہ سے کئی گنا زیادہ ہے کیونکہ اس قرارداد کا براہ راست تعلق مسلمانوں اور یہودیوں سے تھا۔ اس پیمان نامے کی سب سے مشکل بات یہ ہے کہ اس کے متن کو صرف علامہ طبرسی نے نقل کیا ہے۔ ان سے پہلے کسی تاریخی کتاب میں اس کا متن تحریری طور پر موجود نہیں ہے۔ اس مشکل کو تاریخ کے ابتدائی منابع میں موجود وہ شواہد حل کردیتے ہیں

جو اس قراداد کے متن کے متعلق ہیں۔ ان کتابوں میں اگر چہ متن تحریر نہیں ہے لیکن اسی متن کے دفعات اور مواد کی طرف واضح اشارے موجود ہیں:

(الف) جب مدینہ کے تینوں معروف قبائل نے پیمان شکنی کی تو مورخین نے اس واقعہ کے متعلق تحریر کیا ہے کہ ان تینوں قبائل نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کیا تھا۔(24) میثاق مدینہ میں مسلمانوں اور ان قبائل کے درمیان کسی معاہدے کی طرف اشارہ نہیں ہے، اسی طرح ان قبائل کا میثاق مدینہ میں بھی کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ علاوہ ازایں مورخین نے کسی دوسرے معاہدے کا کوئی متن بھی اپنی کتابوں میں تحریر نہیں کیا ہے، جس کی طرف ہم مورخین کی اس بات کی نسبت دیں یا اس کی کوئی توجیہہ پیش کریں۔

(ب) تاریخ کی بعض کتابوں میں یہ تحریر موجود ہے کہ پیغمبر ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ یہ طے کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے نفع اور نقصان میں کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔(25) یہی بات اس قراداد میں موجود ہے، جبکہ میثاق مدینہ میں لکھا ہوا ہے کہ یہودی جنگ کی صورت میں جنگی اخراجات کی ذمہ داری لیں گے۔

(ج) اس طرح مورخین نے لکھا ہے کہ حیی ابن اخطب اور کعب ابن اسد مسلمانوں سے معاہدے کے وقت بنی نضیر اور بنی قریظہ کی طرف سے نمائندے تھے۔(26) یہ بات بھی اس قرارداد کے متن کا حصہ ہے، جبکہ میثاق مدینہ میں طرفین مہاجرین اور انصار تھے۔

(د) بعض تاریخی کتب میں بنی قریظہ کے قتل عام کے بارے میں تحریر ہے کہ ان کی طرف سے پیمان شکنی کے بعد ان کے مردوں کو قتل کیا گیا، جبکہ عورتوں کو اسیر بنایا گیا۔(27) یہ بات اسی انداز میں ہی اس اس پیمان نامے میں موجود ہے، جبکہ میثاق مدینہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس طرح تاریخی منابع میں بھی ان دفعات پر مشتمل کوئی دوسری قراداد کا متن تحریری شکل میں ابھی تک سامنے نہیں آیا ہے۔

(ہ) میثاق مدینہ کے انعقاد کی تاریخ کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ تاریخ کے بنیادی مآخذ کے مطابق ہجرت کے ابتدائی ایام میں یہ منعقد ہوا ہے، دور جدید کے بعض محققین نے اس کے مواد کو دیکھتے ہوئے ہجرت کے کئی سال بعد اس کے انعقاد کو مستند قرار دیا ہے۔(28)

جبکہ یہودیوں کے تین معروف قبائل کے ساتھ ہونے والا معاہدہ ہجرت کے پہلے سال ہی ہوا تھا۔ اس کے بارے میں تاریخی منابع میں ٹھوس شواہد موجود ہیں، چونکہ قراداد کے متن میں آیا ہے کہ یہودی

پیغمبر ﷺ کے پاس آئے اور ان سے دعوت اسلام کے بارے میں سوالات کیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان یہودی قبائل کی پیغمبر سے پہلی ملاقات تھی اور یہ ملاقات یقینی طور پر ہجرت کے ابتدائی ایام میں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ مخریق نے جو کہ اس معاہدے میں بنی قینقاع کی طرف سے نمائندے تھے، ہجرت کے ابتدائی ایام میں اسلام لائے اور جنگ احد میں شہید ہوئے تھے۔(29)

پس ان تاریخی شواہد سے یہ بات قطعی ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کا یہودیوں کے ان قبائل سے معاہدے کا متن اپنے مفاہیم کے اعتبار سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات کی سمت کو معین کرنے میں اس کا خاص کردار ہے اس کے باوجود یہ معاہدہ زیادہ دیر تک اپنی افادیت برقرار نہ رکھ سکا چونکہ یہودیوں کو معاہدے کے دوران یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ مسلمان بہت کم وقت میں طاقت اور کثرت کے حامل ہو جائیں گے۔ اسی لئے وہ اس ذہن کے ساتھ مصالحت کے لئے آمادہ ہوئے تھے کہ ان کے تمام مفادات بعینہٖ محفوظ رہیں گے۔ چونکہ یہودیوں کا خیال تھا کہ حضرت محمد ﷺ محض ایک رئیس قوم بن کے رہیں گے۔ مگر انہوں نے دیکھا کہ وہ توحید کے ساتھ اس کے بنیادی تقاضوں کی برآوری کے لیے بڑی شد ومد کے ساتھ زور دے رہے جن میں سے ایک اپنی رسالت کا اقرار بھی تھا۔ یہ عمل وہ براہ راست اپنی مذہبی سیادت کے لئے خطرہ سمجھنے لگے۔

بنی قینقاع کا واقعہ

قبیلہ بنی قینقاع یہودی قبائل میں سے شجاع ترین قبیلہ تھا۔ ان کے افراد ہر وقت مسلح رہتے تھے اور خود کو ناقابل تسخیر سمجھتے تھے۔ ان کا پیشہ زراعت اور زرگری تھا۔ مسلمانوں اور بنی قینقاع کے درمیان پیش آنے والا یہ واقعہ بدر اور احد کی جنگ کے درمیان رونما ہوا تھا۔ اس واقعہ کی درست تاریخ کے حوالے سے مورخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ واقدی نے اس کی تاریخ ہجرت کے دوسرے سال ماہ شوال بتائی ہے۔ ابن سعد، بلاذری، طبری اور مسعودی نے بھی ان کے اس قول کو ترجیح دی ہے۔(30) جبکہ ابن اسحاق نے صرف اتنا بتایا ہے کہ یہ واقعہ غزوہ سویق اور قُرع کے درمیان پیش آیا تھا۔(31) اس واقع کے اسباب وعلل کے حوالے سے مورخین نے اپنی اپنی کتابوں میں چند اسباب کی طرف اشارہ کیا ہے:

(الف) جب مسلمانوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تھی اس وقت ان کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اس میں یہ قرار پایا تھا کہ یہودی مسلمانوں کے خلاف کسی کی مدد نہیں کریں گے۔ جنگ بدر کے واقعہ کے بعد جب مسلمان واپس مدینہ لوٹے تو یہودیوں نے معاہدے کو توڑ دیا۔ حضرت محمد ﷺ بنی قینقاع کے بازار گئے اور ان کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

تم لوگ جانتے ہو کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اس سے پہلے کہ تمہارے ساتھ بھی کوئی بدر جیسا واقعہ پیش آئے، اسلام قبول کرو۔ بنی قینقاع نے کہا! اے محمد ﷺ تم نے اپنی قوم کے ساتھ جو کچھ بدر میں کیا، اس سے مغرور مت ہو جاو وہ جنگجو نہیں تھے۔ اگر تم ہمارے ساتھ مقابلے کرتے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ ہم جیسا کوئی جنگجو نہیں۔(32)

(ب) بعض مورخین نے اس واقعہ کا ایک سبب یہ بتایا ہے: ایک مسلمان عورت سونا خریدنے کیلے بنی قینقاع کے بازار گئی تھی۔ بنی قینقاع کے کچھ افراد نے ان کی توہین کی تو ایک مسلمان نے غصہ میں آ کر ان میں سے ایک کو قتل کر دیا، جس کے بعد یہودیوں نے اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے بنی قینقاع کے خلاف جنگ کے لئے تیاری کی۔(33)

(ج) واقدی اور ابن سعد نے اس کی وجہ یہ تحریر کی ہے کہ: جنگ بدر میں قریش مکہ کی شکست کے بعد یہودیوں نے شورش برپا کی اور معاہدے کو توڑ دیا جس کے بعد حضرت محمد ﷺ نے کہا کہ مجھے بنی قینقاع سے خوف ہے اور (ان سے جنگ کرنے کے لئے) روانہ ہوگئے۔(34)

بنی نضیر اور مسلمانوں کے درمیان جنگ

بہر حال بنی قینقاع کو مدینہ بدر کرنے کے بعد مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات میں دوسرا شگاف اس وقت بڑا جب بنی نضیر نے رسول اللہ ﷺ کو قتل کرنے کی کوشش کی جس میں وہ اگرچہ ناکام ہوئے، لیکن دونوں کے تعلقات کے لئے یہ عمل خطرناک ثابت ہوا۔ اس واقعہ کو مورخین نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے: بئر معونہ کے واقعہ میں عمرو بن امیہ کو بنی عامر نے گرفتار کیا تھا، جسے بعد میں عامر ابن طفیل نے آزاد کر دیا۔ جس وقت وہ مدینہ کی طرف آرہے تھے تو راستے میں بنی عامر کے دو افراد سے آمنا سامنا ہوا جنہیں عمرو نے بنی عامر کے اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی کی بنا پر انتقاماً قتل کیا جب مدینہ پہنچے تو

حضرت محمد ﷺ عمرو کے اس فعل سے ناراض ہوئے اور بنی عامر کو دیت دینے کا فیصلہ کیا جبکہ دوسری طرف عامر بن طفیل نے ایک پیغام مدینہ ارسال کیا جس میں مقتولین کی دیت کا مطالبہ کیا۔ حضرت محمد ﷺ بنی عامر کو دیت دینے کے لئے یہودیوں سے مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں آپ بنی نظیر کے پاس گئے۔

بنی نضیر نے حضرت محمد ﷺ کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے مدد کا یقین دلایا۔ حضرت محمد ﷺ بنی نضیر کے محلے میں ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے، اسی اثنا میں بنی نضیر کے یہودیوں نے آپس میں میٹنگ کی اور کہنے لگے کہ حضرت محمد ﷺ کو قتل کرنے کا یہ ایک بہترین موقع ہے، دوبارہ ایسا موقع ہاتھ آنے کا امکان نہیں ہے۔ بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ دیوار کے اوپر سے ایک پتھر حضرت محمد ﷺ پر گرا کر قتل کیا جائے۔ اس کام کے لئے عمرو بن جحاش آمادہ ہوا۔ حضرت محمد ﷺ ان کے اس کام سے آگاہ ہوئے اور انہیں بتائے بغیر فوراً اٹھ کر چلے گئے۔ بنی نضیر کے محلے سے نکلتے وقت اپنے اصحاب کو بھی نہیں بتایا۔

مدینہ پہنچنے کے بعد ساری صورتحال سے انہیں آگاہ کر دیا اور محمد ابن مَسلمہ انصاری کو بنی نضیر کی طرف ایک پیغام دے کر روانہ کر دیا۔ محمد ابن مسلمہ نے انہیں بتایا کہ حضرت محمد ﷺ نے کہا ہے کہ تم لوگوں نے اپنا عہد توڑ دیا ہے اور چھت پر چڑھ کر مجھے قتل کرنے کی سازش کی اور تمہیں دس دن کی مہلت دی ہے۔ ان دس دنوں میں مدینہ سے نکل جائے جو بھی اس کے بعد مدینہ میں دیکھا جائے گا اس کی گردن ماری جائے گی۔ بنی نضیر مسلمانوں کی اس الٹی میٹم کے بعد مدینہ چھوڑنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اسی اثنا میں عبداللہ ابن ابی کی طرف سے دو افراد ان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ عبداللہ نے تمہیں پیغام دیا ہے کہ تم مدینہ سے مت نکلو اپنے قلعوں میں رہتے ہوئے اپنے مال، اسباب کی حفاظت کرو میں دو ہزار افراد کے ساتھ مسلمانوں کے پہنچنے سے پہلے تمہاری مدد کے لئے پہنچ جاتا ہوں اور تمہاری خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔

جبکہ بنی قریظہ اور بنی غطفان بھی تمہاری مدد کے لئے آمادہ ہیں۔ اس سلسلے میں عبداللہ ابن اُبَی نے ایک پیغام بنی قریظہ کی طرف بھی روانہ کر دیا اور ان سے مدد کی درخواست کی۔ کعب ابن اسد جو کہ بنی قریظہ کے سرکردہ رہنما تھے اور مسلمانوں کے بنی قریظہ کے درمیان ہونے والے معاہدے کے ضامن بھی تھے،

کہنے لگے کہ میں ہر گز پیمان شکنی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ بنی قریظہ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد عبداللہ بنی نضیر کے رئیس حیی ابن اخطب کے پیچھے چلے گئے تا کہ انہیں مدینہ نہ چھوڑنے پر آمادہ کر سکے۔ بالاآخر حیی ابن اخطب مدینہ نہ چھوڑنے اور مسلمانوں کا سامنا کرنے کے لئے آمادہ ہوگئے اور کہنے لگے کہ ہم اپنے قلعوں کو مضبوط کریں گے اور مال مویشیوں کو قلعوں کے اندر لے جائیں گے اور مقابلے کے لئے پتھروں کو قلعوں کی چھتوں پر لے جائیں گے۔ (35) اس محاصرے کے دوران مسلمانوں نے یہودیوں کو دباو میں لانے کیلئے کھجوروں کے درختوں کو آگ لگادی۔ مسلمانوں کی طرف سے بنی نضیر کے قلعوں کے محاصرے کے دوران کھجور کے درختوں کو مسلمانوں کی طرف سے آگ لگانے کا یہ عمل مد مقابل کے خلاف اپنائے جانے والا ایک نیا حربہ تھا۔

ابن اسحاق اور واقدی کے مطابق اس کام کے لئے خود حضرت محمد ﷺ نے حکم دیا تھا۔(36) اگر سورہ حشر کی آیت نمبر پانچ اس موضوع کی تائید نہ کرتی تو مورخین کی بات کو قابل تردید قرار دیے جانے کا احتمال پیدا ہو جاتا چونکہ اسلام نے جنگ کے دوران درختوں کو کاٹنے سے منع کر دیا ہے۔ جبکہ دوسری طرف حضرت محمد ﷺ نے بھی ایسا کوئی عمل انجام نہیں دیا تھا۔(37) یہی وجہ تھی کہ درختوں کو آگ لگاتے وقت یہودی حضرت محمدؐ سے کہنے لگے کہ آپ فساد سے منع کرتے تھے کیوں درختوں کو آگ لگاتے ہیں۔(38) بنی نضیر کی بھرپور تیاری کی بناپر ان کا محاصرہ طول پکڑنے لگا۔ مورخین نے محاصرے کی مدت چھ سے پچیس دن تک بتائی ہے۔(39) خلاصہ یہ کہ بنی قینقاع کے بعد بنی نضیر یہودیوں کا دوسرا قبیلہ تھا جن کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات تیرگی کا شکار ہوگئے۔ دونوں نے بقائے باہمی کے جذبے کے ساتھ تعلقات استوار کیے مگر مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے وہ نفسیاتی دباو کا شکار ہوئے اور حضرت محمد ﷺ سے کیا گیا معاہدہ توڑنے پر آمادہ ہوگئے۔

بنی قریظہ کی پیمان شکنی

بنی قریظہ یہودیوں کا تیسرا گروہ ہے، جن کے ساتھ مسلمانوں نے معاہدہ کیا تھا پہلے دونوں قبیلوں کی طرح اس قبیلے کے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات بالآخر جنگی صورتحال میں تبدیل ہو چکے تھے۔ بنی قریضہ کے حوالے سے پہلے دونوں قبیلوں کی نسبت سخت فیصلوں کی بناپر محققین نے اس واقعہ کو خاص اہمیت دیتے

ہوئے اس کی جزئیات کے بارے میں تحقیقات انجام دی ہیں۔اس واقعے کے آغاز کے بارے میں مورخین کا کہنا ہے کہ 23 ذیعقدہ بروز بدھ پانچ ہجری کو حضرت محمد ﷺ بنی قریظہ کی طرف روانہ ہوئے تھے اور پندرہ دن تک ان کے محاصرے کے بعد ذی الحجہ کی سات تاریخ کو واپس ہوئے تھے۔(40) اس واقعہ کے اسباب کے بارے میں مورخین کا کہنا ہے کہ بنی نضیر کے واقعے کے بعد حیی ابن اخطب مکہ گئے تاکہ قریش کو مسلمانوں کے خلاف لشکر کشی پر آمادہ کرسکے۔ وہ قریش کے ساتھ اور بھی بہت سے قبائل کو ہمراہ لیے مسلمانوں کے خلاف جنگ لڑنے کیلے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے اس جنگ میں صرف قریش نہیں تھے بلکہ اور بھی قبائل تھے اس بناپر اس جنگ کا نام مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن میں ''احزاب'' کی شکل میں آیا ہے۔ حیی ابن اخطب نے ابوسفیان کو یقین دلایا تھا کہ وہ بنی قریظہ کے یہودیوں کی حمایت بھی حاصل کریں گے اسی بناپر وہ راستے میں قریش سے الگ ہو کر مدینہ گئے تاکہ بنی قریظہ کو بھی اس جنگ کیلے آمادہ کرسکے۔

مدینہ پہنچ کر اس نے غزل بن سموال اور کعب ابن اسد جیسے اہم یہودی رہنماوں کو اپنے جھوٹے وعدوں کے چکر میں پھنسا کر مسلمانوں سے قائم معاہدہ توڑنے پر آمادہ کیا۔(41) جس وقت بنی قریظہ نے معاہدہ توڑ ڈالا، اس وقت مسلمان جنگ احزاب کے لئے مدینہ سے باہر تھے جب اس کی خبر محمد ﷺ تک پہنچی تو سخت دل گرفتہ ہوئے چونکہ مسلمان اس وقت ایک سخت آزمائش سے گزر رہے تھے کہ اچانک اندرونی طور پر مشکلات کا بڑھ جانا ان کے لئے ایک تشویش کی صورتحال کی نشاندہی کر رہی تھی۔ قریش نے مختلف قبائل سے مل کر مدینہ کا محاصرہ کیا ہوا تھا اور مدینہ کے اندر بنی قریظہ بھی قریش کی مدد کے لئے آمادہ ہو چکے تھے۔

بنی قریظہ نے صرف معاہدے کو توڑنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے اس حساس صورت حال میں رات کو مدینہ پر حملہ کی تیاری کرلی اس کے لیے انہوں نے قریش اور بنی غطفان سے دو ہزار فوجی مانگ لئے۔ دوسری طرف حضرت محمدؐ نے ان کی نقل و حرکت کی اطلاع ملنے پر پانچ سو فوجیوں کو مدینہ کی طرف روانہ کیا اور انہیں تاکید کی کہ صبح تک گھروں کی حفاظت کرتے رہیں۔ نباش بن عیسی دس یہودی جنگجوں کے ہمراہ مدینہ پر شب خون مارنے کے لئے مدینہ میں داخل ہوئے تھے مگر بقیع کے مقام پر مسلمانوں سے ان کا آمنا سامنا ہوا جس کے بعد انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔(42)

جنگ احزاب میں لشکر قریش کے عقب نشینی کے بعد مسلمانوں نے بلافاصلہ بنی قریظہ سے حساب برابر کرنے کا فیصلہ کرلیا چونکہ دوران جنگ احزاب کعب ابن اسد کے فیصلے نے مسلمانوں کو انتہائی سخت مشکل میں ڈال دیا تھا چونکہ اگر قریش اور مسلمانوں کے در میان جنگ شروع ہو جاتی تو مدینے کے اندر مسلمانوں کے لئے نہ ختم ہونے والے مسائل شروع ہو سکتے تھے۔ قریش کی عقب نشینی نے نہ صرف مسلمانوں کو داخلی طور پر عدم استحکام سے محفوظ کر دیا بلکہ مسلمانوں کے لئے بنی قریظہ کے خلاف کاروائی کرنے کے لئے میدان بھی فراہم کر دیا۔

مسلمان جنگ احزاب سے فارغ ہونے کے بعد بنی قریظہ کے محاصرے کے لئے روانہ ہوگئے اور وہاں پہنچنے کے بعد ان کا محاصرہ کیا۔ محاصرے کے بعد پہلے لمحے میں ہی مسلمانوں اور یہودیوں میں تیراندازی شروع ہو گئی۔ یہودی بالآخر گفتگو پر آمادہ ہوگئے اور ان کا ایک نمائندہ وفد حضرت محمد ﷺ کے پاس آیا اور جن شرائط کے تحت بنی نضیر تسلیم ہوگئے تھے انھی شرائط کے تحت وہ بھی قلعوں سے اتر کے مدینہ چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر حضرت محمد ﷺ نے ان کی اس تجویز کو قبول نہیں کیا چونکہ حضرت محمد (ﷺ) بنی قینقاع اور بنی نضیر کے تجربے کی روشنی میں بنی قریظہ کو کسی صورت مدینہ سے امن کے ساتھ نکلنے کی اجازت دینے پر آمادہ نہیں تھے۔(43)

جب وہ مسلمانوں کی طرف سے مسلسل محاصرے سے تنگ آگئے توانہوں نے حضرت محمد ﷺ سے تقاضا کیا کہ ان کے ہم پیمان اوسی ابولبابہ بن عبدالمنذر کو ان کے پاس بھیج دیں تاکہ وہ ان کے ساتھ اس حوالے سے مشورہ کر سکیں۔ان کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے ابولبابہ کو ان کے پاس بھیجا گیا یہودیوں نے ان سے پوچھا کہ کیا ہم حضرت محمد ﷺ کے سامنے تسلیم ہو جائیں ؟اس نے جواب دیا کہ ہاں تسلیم ہو جاؤ اس نے ان کو یہ بتانے کے دوران اپنی گردن کی طرف اشارہ کیا یعنی اگر تسلیم نہیں ہو جاؤگے تو تمہاری گردنیں ماری جائیں گی بالآخر بنی قریظہ محاصرے کی سختیوں سے تنگ آکر تسلیم ہونے پر آمادہ ہوگئے۔

جب بنی قریظہ قلعوں سے نیچے اتر گئے تو حضرت محمد ﷺ کے حکم کے تحت مسلمانوں نے انہیں گرفتار کرلیا. اسی دوران قبیلہ اوس کا ایک شخص نے حضرت محمد ﷺ کے پاس آکر تقاضا کیا کہ یہ لوگ ہمارے ہم پیمان رہے ہیں جس طرح بنی قینقاع کو آپ نے عبداللہ بن ابی کی خاطر بخش دیا ہے، اسی طرح بنی

قریظہ کو بھی ہماری خاطر بخش دیں. مگر حضرت محمد ﷺ کی طرف سے انہیں کوئی جواب نہیں ملا۔ جب اوسیوں کا اصرار بڑھنے لگا تو حضرت محمد ﷺ کہنے لگے کہ آپ میں سے کوئی ان کے بارے میں قضاوت کرنے کے لئے آمادہ ہے؟جب انہوں نے مثبت جواب دیا تو حضرت محمد ﷺ نے سعد ابن معاذ کو جو کہ اوسیوں کا بزرگ تھا، بنی قریظہ کے بارے میں قضاوت کے لئے معین کیا اور بعض مورخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ سعد ابن معاذ کا انتخاب خود یہودیوں نے ہی کیا تھا۔(44)

سعد ابن معاذ جنگ خندق میں تیر لگنے کی وجہ سے زخمی ہونے کی وجہ سے ایک خیمہ میں زیر علاج تھے اوسیوں نے احترام کے ساتھ سعد کو حاضر کیا اور ان سے تقاضا کیا کہ عبداللہ بن ابی کی طرح اپنے ہم پیمان (بنی قریضہ) قبیلہ کے بارے میں نیکی سے پیش آو۔ سعد نے ابتدا میں بنی قریظہ سے اپنی حکمیت کے بارے میں ضمانت مانگی جب انہوں نے مثبت جواب دیا تو اس وقت وہ کہنے لگے کہ میرا فیصلہ یہ ہے کہ بنی قریظہ کے مردوں کو قتل کر دیا جائے اور ان کے عورتوں اور بچوں کو اسیر کیا جائے اور ان کے مال و اسباب کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

اگلے دن مسلمانوں نے گڑھے کھود دیے اور بنی قریظہ کے مردوں کو ایک ایک کرکے قتل کر دیا گیا۔ سعد ابن عبادہ اور حباب ابن منذر حضرت محمد ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگے اوس والے اپنے ہم پیمان ہونے کی وجہ سے اس فیصلہ سے ناخوش دیکھائی دے رہے ہیں۔ سعد ابن معاذ کہنے لگا جو اس فیصلہ کو پسند نہیں کرتا ہے خدا اسے بھی پسند نہیں کرتا ہے۔ اسی دوران اوس کا ایک اور بزرگ حضرت محمد ﷺ کے پاس آ کر کہنے لگا کہ بعض اسیروں کو اوسیوں کے حوالے کر دیں تاکہ ہم بھی اس عمل میں حصہ لے سکیں۔

حضرت محمد ﷺ نے انہیں مثبت جواب دیتے ہوئے ان کے کہنے پر عمل کیا۔ مورخین کے مطابق صرف ان لوگوں کو قتل کیا گیا جو بلوغ کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ مردوں میں سے ایک کو نجات مل گئی اسی طرح عورتوں میں سے ایک کو قتل کیا گیا، جس عورت کو قتل کیا گیا تھا اس نے محاصرے کے دوران ایک پتھر مسلمانوں پر گرایا تھا جس کی وجہ سے ایک مسلمان قتل ہوا تھا اس مسلمان کے قصاص میں اسے قتل کیا گیا۔(45)

داستان بنی قریظہ کا ایک جامع جائزہ

بنی قریظہ کے قتل کی داستان ہم نے مسلمان سیرت نگاروں اور مورخین میں سے ابن اسحاق اور واقدی سے نقل کی ہے۔ ان کے بعد جتنے مورخین آئے ہیں انہوں نے بھی بغیر کسی کم وکاست کے اس داستان کو اسی انداز میں نقل کیا ہے۔ معاصر محققین میں سے بعض نے بنی قریظہ کے تمام مردوں کے قتل کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ جب کہ کچھ اور محققین نے، جن کا جھکاؤ تاریخ اسلام کے ابتدائی منابع کی طرف ہے، بنی قریظہ کے مردوں کے قتل عام کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے صحیح ہونے کے بارے میں مختلف دلائل پیش کیے ہیں۔ جن محققین نے اس موضوع کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ :

الف) یہ عمل سیرت پیغمبر ﷺ کے خلاف ہے، پیغمبر نے اپنی زندگی میں بہت سے ایسے لوگوں کو معاف کر دیا ہے جو اسلام سے دشمنی میں معروف تھے بنابر این بنی قریظہ کے سیکڑوں مردوں کا قتل عام اور ان کی عورتوں کو اسیر بنانا ان کی سیرت سے میل نہیں کھاتا ہے۔

ج) بعض مورخین کا کہنا ہے کہ قتل کئے گئے افراد علی اور زبیر کے ہاتھوں سے قتل ہوئے ہیں. چھ سو سے نو سو کی تعداد ایک یا آدھے دن میں دو افراد کے ہاتھوں قتل ہونا بعید نظر آتا ہے. اس کے علاوہ اتنی بڑی تعداد کو قتل کرنے میں جو نفسیاتی اور اعصابی اثرات انسان پر مرتب ہونے کا امکان ہے ان کو دیکھتے ہوئے ان دو کے ہاتھوں اتنی بڑی تعداد کا قتل ہونا بعید نظر آتا ہے اس کے علاوہ قرآن کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو سورہ احزاب کی آیت ۲۶ میں بنی قریظہ کے مردوں کے انجام کے بارے میں یوں ذکر ہوا ہے۔ " فریق تقتلون وتأسرون فریقاً "یعنی ایک گروہ کو قتل کیا اور ایک گروہ کو اسیر کیا۔قرآن کی یہ تعبیر بتارہی ہے کہ مردوں میں سے ایک گروہ کو قتل کیا اور دوسرے گروہ کو اسیر کیا۔

اس آیت سے یہ معنی نہیں نکلتا ہے کہ بنی قریظہ میں سے مردوں کے گروہ کو قتل کیا عورتوں کے گروہ کو اسیر کیا گیا۔ چونکہ اس آیت کا ابتدائی حصہ بنی قریظہ کے جنگجوؤں کے حوالے سے ہے۔ لہٰذا اس آیت میں دونوں صورتوں میں فریقاً سے مراد بنی قریظہ کے جنگجو مرد مراد ہیں اس کے علاوہ اس واقعہ کے بارے میں جو تاریخی شواہد ہیں ان میں ہمیں ہم آہنگی دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ ایک گڑھا کھود کر اس کے اطراف میں ان کی گردنیں ماری گئی، کبھی کہا جاتا ہے کہ انہیں مسلمانوں میں تقسیم کیا گیا، اس طرح کچھ

روایات میں کہا جاتا ہے کہ صرف جنگجو مردوں کو قتل کیا گیا کچھ اور روایات میں کہا جاتا ہے کہ تمام بالغ مردوں کو قتل کیا گیا اور پھر ہزار اسیروں کو بنی قریظہ کے علاقے سے مدینہ منتقل کرنا اور انہیں ایک دو افراد کے گھروں میں قید کرنا اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے ناممکنات میں سے دیکھائی دے رہا ہے۔

یہاں تک کہ آج کے دور میں اتنی بڑی تعداد کو ایک جگہ میں قید کرنا بہت ساری مشکلات کا سبب بنتا ہے۔ ان کے لئے کھانے کا اہتمام، فرار کرنے سے روکنا، رات کی تاریک میں ان کی حفاظت کا مسئلہ، ان کے لئے قضائے حاجت کے لئے مناسب جگہ کی بندوبست یہ سب ایسے مسائل ہیں جن سے نمٹنا آسانی سے ممکن نہیں جبکہ تاریخی منابع میں ان جزئیات کے حوالے سے کوئی بحث نہیں کی گئی ہے۔اس کے علاوہ قرآن میں موجود ہے کہو ''وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ'' (اسراء/بنی اسرائیل۔۱۵)اس آیت کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ بنی قریظہ کے واقعہ میں صرف ان کے بزرگوں میں سے چند فیصد لوگوں نے دشمنی دکھائی ہے ان چند کی غلطی کی سزا باقی افراد کو دینا اسلام کے احکام کے خلاف ہے۔(46)اس طرح جن محققین نے سعد کے فیصلے اور یہودیوں کے قتل عام کو درست تسلیم کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ:

- حضرت محمد ﷺ کی بنی قریظہ کے خلاف سخت ردِ عمل دکھانے کی وجہ یہ تھی کہ بنی قریظہ انتہائی سخت حالات میں معاہدے کو توڑ کر مدینہ میں شب خون مارنے کی تیاری کر رہے تھے، اگر خدا کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو مسلمان ان حالات سے بچ نہ پاتے، بنابرایں ان حالات میں خیانت کرنے والوں کی سزا موت کے علاوہ کچھ نہیں۔
- پیغمبر اکرم ﷺ نے بنی قینقاع اور بنی نظیر کی پیمان شکنی کے حوالے سے چشم پوشی کے کام لیتے ہوئے صرف انہیں مدینہ بدر کیا کوئی جسمانی سزا نہیں دی، جس کے نتیجے میں انہوں نے مدینہ سے نکلنے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نہ ختم ہونے والی سازشیں شروع کیں۔ دشمنان اسلام کو اکٹھا کرکے مسلمانوں کے خلاف ایک بڑی جنگ چھیڑ دی۔ ان عظیم تجربات کو دیکھتے ہوئے ایک مدبر اور حکیم لیڈر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ دوبارہ ان تجربات کو مت دہرائے جن سے پہلے وہ گزر چکا ہے۔ اس بناء پر مسلمانوں نے انہیں قتل کیا اگر وہ انہیں قتل نہیں کرتے تو وہ اس دفعہ مسلمانوں کا خاتمہ کر سکتے تھے۔

- سعد بن معاذ کا فیصلہ اس معاہدے کے عین مطابق تھا جو بنی قریظہ کے یہودیوں نے حضرت محمد ﷺ سے کیا تھا۔ انہوں نے یہ ضمانت دی تھی کہ مسلمانوں کے دشمنوں کی مدد نہیں کریں گے اگر کوئی ایسا قدم انہوں نے اٹھایا تو انہیں قتل کیا جائے گا اور ان کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کیا جائے گا اور ان کے مال و اسباب کو اپنے تصرف میں لایا جائے گا۔ (47)

جنگ بنی قریظہ میں مقتولین کی تعداد کا ایک جائزہ

اس واقعہ کا ایک اہم پہلو یہودی مقتولین کی تعداد ہے، چونکہ بنی قریظہ کے واقعہ میں مقتولین کی تعداد کا زیادہ نقل ہونے کی وجہ سے مورخین مقتولین کی اصل تعداد کے بارے میں شک و تردد کا شکار ہیں۔ اسی لیے ابھی تک اس واقعہ کی صحیح تعداد کے بارے میں یقینی صورت حال سامنے نہیں آئی ہے۔ نتیجتاً اس واقعہ کے اور بھی گوشے شک و تردد کے شکار ہوئے۔ اسی بنا پر اس موضوع کو دقیق انداز میں لینے کی ضرورت ہے۔ بعض مورخین کا اس حوالے سے کہنا ہے کہ پیغمبر ﷺ نے انہیں بنی نجار کی ایک عورت کے گھر قید کر دیا تھا۔ اس کے بعد مدینہ کے بازار میں گڑھے کھود کے ان کو قتل کرنے کا آغاز کر دیا۔ اس وقت ان کی تعداد چھ سو سے سات سو تک تھی، ان کی زیادہ سے زیادہ تعداد آٹھ سو سے نو سو کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ (48)

اسی طرح ابن ہشام نے اپنی سیرت کی کتاب میں ایک اور جگہ لکھا ہے کہ: ''جس وقت رسول خدا ﷺ کو بنی قریظہ کے خلاف کامیابی ملی تو ان میں سے چار سو مردوں کو گرفتار کر لیا اور ان کے قتل کا حکم جاری کیا۔ خزرجیوں نے اس کام کو بہ خوشی شروع کر دیا جبکہ اوسی حضرات ان کے ہم پیمان ہونے کی وجہ سے اس کام سے خوش نہ تھے جب بنی قریظہ کے مردوں کی تعداد بارہ رہ گئی تو ان باقی ماندہ افراد کو اویسوں کے حوالے کر دیا گیا ان میں سے ہر یہودی قبیلہ اوس کے دو افراد کے ہاتھوں قتل ہوا۔'' (49)

ترمذی نے مقتولین کی تعداد چار سو بتائی ہے۔ (50)

بیہقی نے موسیٰ ابن عقبہ سے نقل کیا ہے کہ ''کہا جاتا ہے کہ بنی قریظہ کے مقتول جنگجوؤں کی تعداد چھ سو تھی اور ان کے خون احجار الزیت تک پہنچا تھا۔ (51) یعقوبی اور شیخ مفید ے مقتولین کی تعداد بالترتیب سات سو پچاس اور نو سو بتائی ہے۔ (52)

ابو عبید نے اپنی کتاب "الاموال" میں زہری سے روایت کرتے ہوئے صرف اتنا کہا ہے کہ اس دن لوگوں کی ایک تعداد ماری گئی۔(53) ابن ابی الحدید معتزلی نے سب سے زیادہ ایک ہزار افراد کی تعداد بتائی ہے۔(54)اس کے علاوہ اور بھی مورخین ہیں، جنہوں نے ابن اسحاق سے نقل کرتے ہوئے چھ سو سے نو سو کے درمیان مقتولین کی تعداد بتائی ہے۔(55)

بنابرایں جو اقوال بنی قریظہ کے مقتولین کی تعداد کے بارے نقل ہوئے ان میں سے سات سو پچاس درمیانی عدد ہے، چونکہ بالاترین عدد ایک ہزار نقل ہوا ہے، جبکہ کم ترین عدد چار سو ہے۔اس واقعہ کے حوالے سے جتنے شکوک اور شبہات سامنے آئے ہیں، اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو اس کی بنیادی وجہ مقتولین کی تعداد کے حوالے سے مورخین کے درمیان اختلافات ہیں۔اس سے بڑھ کر یہ کہ مقتولین کی جو مختلف تعداد نقل ہوئی ہے ان میں بھی بعض دفعہ اختلافات سامنے آئے ہیں، بعض نے صرف بنی قریظہ کے جنگجوؤں کو مقتولین میں سے قرار دیا ہے، جبکہ کچھ اور نے بنی قریظہ کے تمام مردوں کو مقتولین میں شامل کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ معاصر محققین کے لئے صحیح تعداد کو سامنے لانا ایک مشکل کام بن گیا ہے۔

اگر ہم کلی طور پر مورخین کے عمل کو دیکھیں تو صرف بنی قریظہ کے معاملے میں ہی یہ مسئلہ درپیش نہیں ہے بلکہ جب مورخین تاریخی رویداد کو نقل کرتے ہیں یا جنگ کے بارے میں لکھتے ہیں تو ان کے درمیان اختلاف نظر نمایاں رہتا ہے۔ بہت کم دیکھا گیا ہے کہ مورخین کے درمیان کسی واقعہ کے حوالے سے متفاوت اقوال نقل نہ ہوئے ہوں۔ بطور نمونہ کچھ تاریخی حوادث کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جن سے واضح ہوگا کہ مورخین میں اختلاف کے علاوہ کچھ مبالغہ آمیز باتیں بھی ہمیشہ جاری رہی ہیں۔ طبری نے حضرت موسیٰؑ کے دور میں طاعون کی وبا میں مارے جانے والوں کی تعداد ستر ہزار بتائی ہے۔(56)وہ بھی کئی گھنٹوں کے اندر جبکہ اسی کتاب میں ہی کمترین عدد بیس ہزار بھی نقل ہوئی ہے۔ جنگ جمل میں مارے جانے والے افراد کی تعداد تاریخ میں اس طرح آئی ہے چھ سو، سات سو، ہزار، بارہ سو، تیرہ سو۔(57)

نصر ابن مزاحم نے جنگ صفین کے حوالے سے اپنی قدیم ترین اور معتبر ترین کتاب میں مقتولین کی تعداد ۴۵ہزار شامی اور ۲۵ہزار عراقی مجموعی طور پر ۷۰ ہزار بتائی ہے۔ جبکہ اس کتاب میں کسی اور جگہ صرف لیلۃ الحریر کے دن اور رات کو مقتولین کی تعداد ستر ہزار بتائی ہے۔(58) بنابرایں ان کے بعد جتنے

مورخین نے اس حوالے سے لکھا ہے انہوں نے یہی ستر ہزار کی تعداد بتائی ہے۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں مبالغہ آرائی اور تناقضات بھی کثرت کے ساتھ موجود ہیں جو بھی ان منابع سے سروکار رکھتا ہے اس کے لیے بعض دفعہ اصل حقیقت تک پہنچنا یا کم از کم حقیقت کے نزدیک ہونا ناممکن رہتا ہے۔ اس حوالے سے مسلمان مورخ اور جامعہ شناس ابن خلدون کی بات قابل توجہ لگتی ہے۔ وہ اپنے مقدمہ میں مورخین کی مبالغہ آرائی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"و کثیراً ما وقع للمورخین والمفسرین ۔۔۔ولا بد من ردها الی الاصول و عرضها علی القواعد۔" (59)

یعنی "چنانچہ مورخین، مفسرین اور ائمہ نقل کو حکایات و واقعات میں بہت غلطیاں محض اس لئے پیش آئیں کہ انہوں نے صرف نقل پر قناعت کر لی اور واقعات کو ان کے اصول و معیار پر کس کر نہیں دیکھا اور اشتباہ نظائر پر قیاس نہیں کیا۔ انہیں حکمت و فلسفہ کی کسوٹی پر کسا اور نہ کائنات کے طبقوں پر پرکھا اور نہ ان پر نظر بصیرت کو پہنچ بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صحیح راہ کھو بیٹھے اور اوہام و اغلاط کے میدان میں سرگرداں بھٹکتے ہوئے رہ گئے خصوصاً اموال و افواج کی تعداد میں تو بے شمار غلطیوں کا شکار ہوئے۔"

اس کے بعد وہ آگے لکھتے ہیں:

"وقد نجد الکافة من اهل العصر اذا افاضوا فی الحدیث عن عساکر الدول التی لعهدهم او قریباً منه وتفاوضوا فی الاخبار عن جیوش المسلمین أو النصاری احصاءِ اموال الجبایات و خراج السلطان و نفقات المترفین و بضائع الاغنیاءِ الموسرین توغلوا فی العدد" (60)

"ہم اپنے زمانے کے اکثر عوام کو دیکھتے ہیں کہ جب وہ اپنے زمانے یا قریبی زمانہ کی حکومت کے لشکروں کی تعداد بیان کرتے ہیں یا مسلمانوں کی عیاشیوں کی فوجوں کی تعداد کا ذکر کرتے ہیں یا

ٹیکس و خراج کے مال گنواتے ہیں یا مالداروں کے خرچے اور دولت مندوں کے سامان بتانے لگتے ہیں تو تعداد میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں اور مروجہ حدوں سے آگے پھلانگ جاتے ہیں۔ "

تاریخ میں ہمیشہ سے تعداد اور ارقام کے نقل کرنے میں مبالغہ آرائی سے بھی کام لیا جاتا رہا ہے اس کے پیچھے مختلف قسم کے اہداف کارفرما رہے ہیں۔ مسعودی جنگ جمل کے مقتولین کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ بعض نے ان کی تعداد کم کرکے سات ہزار بتائی ہے جبکہ کچھ اور نے ان کی مقدار بڑھاتے ہوئے دس ہزار بتائی ہے۔ بنی قریظہ کے مقتولین کے بارے میں اب تک جتنے اقوال نقل ہوئے ہیں ان کی روشنی میں اور تاریخ کے اندر پائے جانے والے تناقضات اور مبالغہ آرائی کو دیکھتے ہوئے اس واقعہ کے مقتولین کی اصل تعداد معلوم کرنا بہت مشکل دکھائی دیتا ہے۔ اس کے باوجود کچھ تاریخی قرائن کی روشنی میں مقتولین کی تعداد کے بارے میں کچھ احتمالات بیان کئے جاسکتے ہیں:

(الف) تاریخی منابع میں بنی قریظہ کے مقتولین کی جو تعداد بیان ہوئی ہے وہ امکانی طور پر بنی قریظہ کے ان افراد کی ہے جو قلعوں سے نیچے آئے تھے پھر ان میں سے مردوں کو قتل کیا گیا اور عورتوں اور بچوں کو اسیر کیا گیا۔ تاریخ ابتدائی منابع میں یوں بیان ہوا ہے کہ جب وہ قلعوں سے نیچے آئے تو سعد نے ان کے بارے میں فیصلہ دے دیا۔ اس احتمال کی رو سے مقتولین کی تعداد امکانی طور پر ایک سو بیس سے ایک سو پچاس تک بیان کی جاسکتی ہے چونکہ نقل شدہ اقوال میں سے درمیانی تعداد سات سو پچاس تھی اگر ہم ہر گھر میں پانچ یا چھ افراد فرض کرلیں تو بالغ افراد کی تعداد کے بارے میں امکانی طور پر ۱۲۰ سے ۱۵۰ تک اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(ب) واقدی نے بنی قریظہ کے اسیر بچوں اور عورتوں کی تعداد ہزار بتائی ہے۔(61) ان کی اس تعداد کو دیکھتے ہوئے امکانی طور پر یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ بنی قریظہ کی آبادی بارہ سو افراد پر مشتمل تھی چونکہ اگر بچوں اور عورتوں کی کل تعداد ہزار تھی تو امکانی طور پر ان میں ۱۵۰ سے ۲۰۰ کے قریب بالغ افراد ہونگے اور یہی بالغ افراد کو امکانی طور پر مقتولین میں سے قرار دیا جاسکتا ہے جبکہ بنی قریظہ کے واقعہ میں بالغ مردوں کو قتل کیا گیا ہے۔

ان احتمالات اور مفروضوں کی تائید کچھ تاریخی قرائن اس طرح تاریخی منابع میں آئے ہیں کہ جنگ خندق اور بنی قریظہ میں مسلمانوں کی تعداد تین ہزار بتائی گئی ہے۔(62) یعقوبی نے ان کی تعداد سات سو بتائی ہے۔(63) بعض محققین نے کچھ شواہد کی بنا پر یعقوبی کی نظر کو درست قرار دیا ہے۔(64) اگر ہم مسلمانوں کی تعداد بنی قریظہ کے واقعہ میں سات سو قرار دیں تو یہ بات ممکن نہیں کہ بنی قریظہ کی تعداد بھی مسلمانوں کے برابر ہو۔ اگر مسلمانوں کی تعداد تین ہزار بھی فرض کرلیں تو پھر بھی کوئی مقایسہ نہیں بنتا ہے چونکہ بنی قریظہ یہودیوں کے متعدد قبیلوں میں سے ایک تھا۔ مقتولین کی تعداد کا مسلمانوں کی تعداد کے برابر ہونا ایک ناممکن بات ہے۔ابن ابی الحدید متعزلی نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں: مدینہ میں یہودیوں کے تینوں قبیلوں کے افراد کی تعداد بہت کم تھی۔(65)

یہ بات بھی اس حوالے سے قابل توجہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ بنی قینقاع کی تعداد اتنی کم تھی کہ مدینہ سے کوچ کرنے کے بعد بہت جلد ان کی نسل کا خاتمہ ہوا اور تاریخ میں کہیں بھی ان کے مدینہ بدر ہونے کے بعد تذکرہ نہیں۔ بنابرایں بنی قریظہ کی تعداد بغیر کسی دلیل کے چار اور پانچ ہزار قرار دینا مبالغہ آرائی قرار دیا جاسکتا ہے۔ جبکہ اس زمانے میں مدینہ کی پوری آبادی کے بارے میں پندرہ ہزار کا تخمینہ لگایا جاتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہودیوں کے متعدد قبیلوں میں سے صرف ایک قبیلے کی تعداد اتنی حد تک پہنچ چکی ہو۔ بنابریں کہا جاسکتا ہے کہ مورخین کے نقل کردہ مقتولین کی تعداد اگرچہ مقتولین بنی قریظہ کی صحیح تعداد معلوم کرنا ایک مشکل کام ہے مگر امکانی طور پر ایک سو بیس سے دو سو تک مقتولین کی تعداد بیان کی جاسکتی ہے۔

چونکہ مورخین یہ بھی اپنی تاریخی منابع میں لکھتے ہیں کہ بنی قریظہ کے مردوں کو گرفتار کرکے مدینہ کی ایک عورت کے گھر قید کیا گیا، اس وقت کے اجتماعی حالات کو دیکھتے ہوئے کیا یہ امکان ہے کہ بنابر نقل مورخین چھ سو سے نو سو افراد کو ایک گھر میں قید کیا جائے۔ بنابریں یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک عورت کے گھر اتنی بڑی تعداد کو قید کرنے کی بات غلط ہے یا چھ سو سے نو سو کی تعداد کے نقل میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ ان مختلف قرائن، شواہد سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بنی قریظہ کے مقتولین کی تعداد نقل کردہ تعداد سے کہیں کم تھیں اور ہم نے جو احتمالات بیان کئے ان کی روشنی میں ان کی تائید میں موجود

بعض تاریخی شواہد کی روشنی میں امکانی طور پر ایک سو بیس سے ایک سو پچاس کے قریب بنی قریظہ کے مقتولین کی تعداد بیان کی جاسکتی ہے۔

بنی قریظہ کے واقعہ میں یہودیوں کے بالغ افراد کا قتل ہونا بہر حال ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اس کو رد کیا جاسکتا ہے اور نہ جھٹلایا جاسکتا ہے۔ جو چیز یقینی شکل و صورت کے ساتھ ہمارے سامنے نہیں آتی ہے وہ مقتولین کی اصل تعداد ہے چونکہ تمام قدیم اور متاخر مورخین کے درمیان ایک رائے نہیں ہے۔ بنابریں مدینہ کی اجتماعی صورت حال اور تاریخی منابع میں موجود بعض قرائن کی بناپر یہ بات امکانی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ مورخین نے اپنی سابقہ روش کو برقرار رکھتے ہوئے اس واقعہ میں بھی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اس لئے مقتولین کی اصل تعداد کو امکانی صورت میں ہی بیان کیا جاسکتا ہے یقینی صورت میں بیان کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔ سید ابولاعلیٰ مودودی، یہودیت قرآن کی روشنی میں، ادارہ ترجمان القرآن، ۱۹۹۶ء، ص: ۲۲۵، لاہور

2۔ الاغانی، ابوالفراج علی بن الحسین الاصفہانی، دار احیاالتراث العربی، ۱۹۹۴م، ص: ۳۴۳، بیروت

3۔ عبدالرحمٰن سھیلی، الروض الانف، تحقیق وکیل، دار احیاالتراث العربی، ۱۴۱۲ھ، ص: ۲۹۰، بیروت

4۔ حسین توفیقی، آشنائی باادیان بزرگ، سمت، ۱۳۷۹ش، ص: ۱۵۲، تہران

5۔ احمد بن یحییٰ بلاذری، فتوح البلدان، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۵ق، ص: ۲۹، بیروت

6۔ محمد بن یعقوب الکلینی، الروضۃ من الکافی، تصحیح الغفاری، کانون العربی، ۱۴۱۲ق، ص: ۳۵۹، تہران

7۔ سورہ بقرہ، آیہ ۱۲۶، سورہ انعام ۲۰، سورہ اعراف ۱۵۷

8۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، محولہ بالا، ص ۲۲۸

9۔ الاغانی ج ۲۲ ص ۳۴۴۔

10۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ محولہ بالا، ص: ۲۲۸

11۔ الاغانی، کتاب غزوہ بنی قریظہ، مطبوعہ دار الحیاۃ، س ن، ج۱۹، ص۱۹۱، بیروت

12۔ مودودی، سید ابوالاعلیٰ، محولہ بالا، ص: ۲۲۹

13۔ ایضاً، ص: ۲۷۸

14۔ عبد الملک بن ہشام المعافری، السیرۃ النبویہ، دار لمعرفۃ، س ن، ج ۲ ، ص: ۲۱۵، بیروت

15۔ احمد بن ابی یعقوب الیعقوبی، تاریخ الیعقوبی تحقیق مھنا، موسسۃ الاعلمی للمطبوعات، ۱۴۱۳ھ، ج۱، ص۳۱۰، بیروت

16۔ احمد بن یحییٰ بلاذری، الانساب الاشراف، تحقیق سھیل زکار، دار الفکر، ۱۴۱۷ق،، ج۱، ۳۴۰، بیروت

17۔ برہان زریق، الصحیفۃ میثاق الرسول، دار النمیر۔ ۱۹۹۶م، ص ۵۴۵، دمشق

18۔ الاغانی، ص ۲۹۷

19۔ محمد بن احمد الذہبی، تاریخ الاسلام (المغازی)، تحقیق تدمیری، دار الکتاب العربی، ۱۴۱۰ق،، ج۱، ص ۴۵۴، بیروت

20۔ شھلا بختیاری، پیامبر و یہود مدینہ، انتشارات امیر کبیر، ۱۳۶۳ش، ص ۱۲۴، تہران

■ الاموال، ص ۲۹۷

21۔ جعفر مرتضی العاملی، الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم، دار السیرۃ، ۱۹۹۵م، ج ۴، ص ۲۵۵، بیروت

22۔ محمد حسنین ھیکل، حیاۃ محمد، مطبعہ السنہ المحمدیہ، ۱۹۶۸م، ص ۲۲۷، قاھرہ

23۔ فضل بن حسن طبرسی، اعلام الوریٰ باعلام الھدی، تحقیق و نشر موسسہ آل البیت لاحیا التراث، ۱۴۱۷ق، ص ۱۵۷، قم

■ محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، دار احیا التراث العربی، ۱۴۰۳ق، ص ۱۱۰، بیروت

24۔ المغازی، ج۱ ص ۴۵۴ ۔ فتوح البلدان، ص ۳۰۔ تاریخ یعقوبی، ج۱ ، ص ۱۷ ۳۔ طبری، ج ۲، ص ۱۷۲۔

25۔ المغازی، ج۱، ص ۴۵۴۔ معالم التنزیل ج ۴ ص ۳۱۳۔

26۔ سیرہ ابن ہشام، ج۱، ص ۱۹۱ ۔ انساب الاشراف، ج۱، ص ۳۷۳۔ طبری، ج ۲، ص ۲۲۵

27۔ تاریخ یعقوبی، ج۱، ص ۱۷ ۳

28۔ محمد والیہود، ص ۸۳

29۔ المغازی، ج۱، ص: ۳۶۳

30۔ محمد بن سعد زھری، الطبقات الکبری، تحقیق عبد القادر عطا، دار الکتب العلمیہ ۱۴۱۸ق، ج ۲، ص ۲۱، بیروت

◙ محمد بن جریر الطبری، تاریخ الامم والملوک، موسسہ الاعلمی للمطبوعات، ۱۴۰۹ق، ج ۲، ص ۱۷۳، بیروت

31۔ سیرہ ابن ہشام، محولہ بالا، ج ۲، ص 47

32۔ المغازی، ج ۱، ص ۱۷۶۔ سیرہ ابن ہشام، ج ۲، ص ۴۷

33۔ سیرہ ابن ہشام ج ۲ ص: ۴۸

34۔ الطبقات الکبری، ج ۲، ص ۲۰۲۔ انساب الاشراف، ج ۱، ص ۳۷۱

35۔ سیرہ ابن ہشام، ج ۲ ص ۱۸۶، ۱۹۰، ۱۹۱۔ المغازی، ج ۱، ص ۳۶۴، ۳۶۵

36۔ المغازی، ج ۱، ص ۳۷۱۔ الارشاد، ج، ص ۹۲

37۔ الکافی ج ۵، محولہ بالا، ص ۲۹

38۔ سیرہ ابن ہشام، ج ۲، ص ۱۹۱۔ المغازی، ج ۱، ص ۳۷۳

39۔ محمد بن یوسف صالحیی شامی، سبل الھدی والرشاد، تحقیق عبد الموجود، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۴ق، ج ۴، ص: ۱۸۱، بیروت

40۔ طبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۵۷۔ التنبیہ والاشراف، ص ۲۱۷۔ المغازی، ج ۱، ص ۴۹۶

41۔ ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۲۲، ۲۲۱۔ المغازی، ج ۱، ص ۴۵۴ تا ۴۵۶.

42۔ المغازی، ج ۱، ص ۴۶۰ تا ۴۶۳

43۔ سیرۃ ابن ہشام، ص: ۵۰۹، ۴۹۹

44۔ ایضاً، ص: ۲۴۰

45۔ عبد الرزاق بن ھمام صنعانی، المصنف، تحقیق اعظمی، منشورات المجلس العلمی، ۱۳۹۲ق، ج ۵، ص: ۳۷۱، بیروت

46۔ سید جعفر شھیدی، تاریخ تحلیلی اسلام، مرکز نشر دانشگاہی، ۱۳۷۸، ص ۸۸، تہران

◙ علی اکبر حسنی، تاریخ تحلیلی وسیاسی اسلام، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، ۱۳۷۳، ص ۲۱۱، ۲۲۵، تہران

◙ غلام حسین زر گری نژاد، تاریخ صدر اسلام۔ سمت، ۱۳۷۸، ص ۴۶۱، تہران

47۔ محمد جواد مغنیہ، اسرائیلیات القرآن، دار الجواد، ۱۴۰۴ق، ص ۲۶، بیروت

◙ جعفر سبحانی، فروغ ابدیت، نشر دانش اسلامی، ۱۳۶۳، ج ۲، ص ۱۵۵، قم

48۔ ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۴۱

49۔ ایضاً، ص: ۵۹

50۔ محمد بن عیسی ترمذی، الجامع الکبیر، تحقیق عواد معروف ،دار الغرب الاسلامی، ۱۹۹۸ق، ج ۳، ص ۲۳۹، بیروت
51۔ احمد بن حسین بیہقی، دلائل النبوۃ، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۵م، ج ۴، ص ۲۰، بیروت
52۔ محمد بن محمد بن النعمان الشیخ المفید، الارشاد فی معرفۃ حجج اللہ علی العباد، تحقیق و نشر موسسہ آل البیت لاحیاء التراث، ۱۴۱۶ق، ج ۱، ص ۱۱۱، بیروت
53۔ الاموال، ص ۱۶۳
54۔ علی بن احمد الاندلسی (ابن حزم)، جوامع السیرۃ النبویہ ،دار ابن کثیر، ۱۴۰۶ق، ص ۳۲۸، بیروت
55۔ علی بن ابراہیم القمی، تفسیر القمی، مکتبۃ الھدی، ۱۳۸۷ق، ج ۲، ص: ۱۹۰، نجف
56۔ طبری، ج ۱، ص ۳۰۹
57۔ محمد بن نعمان المفید، الجمل، تحقیق میر شریفی ،مکتب الاعلام الاسلامی، ۱۳۷۴، ص ۴۱۹، قم
58۔ نصر بن مزاحم المنقری، وقعۃ صفین، تحقیق عبد السلام محمد ھارون ،الموسسۃ العربیہ، ۱۳۸۲ق، ص ۴۷۴، ۵۵۸، القاہرہ
59۔ تاریخ ابن خلدون، ج ۱، ص ۱۳
60۔ ایضاً، ص: ۱۵
61۔ المغازی، ج ۱، ص ۵۲۳
62۔ ابن ہشام، ج ۲، ص ۲۲۔ طبقات الکبریٰ، ج ۲، ص ۵۱، ۵۷
63۔ تاریخ یعقوبی، ج ۱، ص ۳۶۹
64۔ ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح البخاری، دار الکتب العلمیہ ، س ن، ج ۹، ص: ۱۸۱، بیروت
65۔ ابو حامد ھبۃاللہ ابن ابی الحدید المدائنی ،شرح نہج البلاغہ، تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم ،داراحیا التراث العربی، ۱۳۸۵ق، ج ۱۳، ص ۱۷۲، بیروت

حج کی اہمیت اور فلسفہ

(نہج البلاغہ کی روشنی میں ایک مطالعہ)

روشن علی*
roshanali007@yahoo.com

کلیدی کلمات: حج، استطاعت، فرض، فلسفہ، خانہ کعبہ، امت، اجتماع وغیرہ

خلاصہ

حج عالم اسلام کے تمام اجتماعات میں سب سے زیادہ اہم، طولانی اور متنوع اجتماع ہے، جس کو عوامی اسلامی اجتماع کا نام دینا بجا ہے۔ ہر شخص پر استطاعت کی صورت میں زندگی میں ایک بار یہ فریضہ بجالانا واجب ہے۔ حج کے دوران تمام حجاج خاص ایام میں خاص اعمال انجام دینے کے پابند ہیں۔ سب کا ایک طرح کا لباس پہننا اور ایک طرح کے کلمات ادا کرنا ضروری ہے۔ یہ دنیا میں ایسا بے مثال عمل ہے، جس میں ایک ہی وقت اور ایک ہی جگہ کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ سب افراد پر لازم ہے کہ وہ اس عمل کو ماہ ذوالحجہ کے خاص دنوں میں انجام دیں نہ کسی دوسرے ماہ یا دوسرے دنوں میں۔ اسی طرح سب پر لازم ہے کہ وہ اس عمل کو ایک خاص سرزمین پر انجام دیں، ایسی سرزمین جس پر پہلی بار خداوند یکتا کی عبادت کیلئے ایک گھر تعمیر کیا گیا، جس گھر کو بیت اللہ کہا جاتا ہے۔ اس مقالے میں بیت اللہ کی عظمت و تاریخ نیز حج کے فلسفہ، اہمیت اور احکام کو نہج البلاغہ کی روشنی میں بیان کیا جائے گا۔

*۔ اسٹنٹ پروفیسر اسلام آباد ماڈل کالج فار بوائز، ایف 10/3 اسلام آباد

مقدمہ

پیغمبر اکرم ﷺ نے مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور مساوات کے بارے میں مشہور و معروف حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ اے لوگو، تم لوگوں کا پروردگار ایک ہے، تم لوگوں کا باپ ایک ہے، تم سب لوگ آدم علیہ السلام کے فرزند ہو، اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔ تم میں سے سب سے زیادہ قابل احترام وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر تقوی کے ذریعے۔آپ ﷺ نے یہ باتیں، جو وحدت اور اتحاد کی طرف دعوت ہیں، مکہ، منی اور عرفات کی سرزمین پر، حج انجام دیتے ہوئے، اپنی زندگی کے آخری حج کے موقع پر ارشاد فرمائی تھیں، جو حجۃ الوداع کے نام سے معروف ہے۔ آپؐ نے اس اعلان کیلئے اس جگہ کا انتخاب کیا، تاکہ قیامت تک جب بھی لوگ یہاں حج کرنے آئیں تو وہ پیغمبر اکرم ﷺ کی نصیحت کو یاد کریں اور ہوشیار ہو رہیں کہ تفرقہ بازی کا راستہ اختیار نہ کریں۔ یہاں پر ایک دوسرے کے ہاتھ کو دوستی اور بھائی چارے سے دبائیں۔ باہمی اتحاد کی تمام رکاوٹوں کو ختم کر دیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مادی اور معنوی معاہدوں اور تحائف کا تبادلہ کریں۔ اسی طرح امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام جو کہ نبی کریم ﷺ کے خلیفہ اور جانشین ہیں انہوں نے بھی اپنے خطبات، مکتوبات اور اقوال وغیرہ میں حج کا فلسفہ اور اہمیت بیان فرمائی ہے۔ ہم اس مقالے میں بعض نمایاں عناوین کے تحت نہج البلاغہ کی رروشنی میں حج کے فلسفہ، اہمیت اور احکام وغیرہ کو بیان کرنے کی سعی کریں گے۔

خانہ کعبہ کی عظمت

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام حج کی فرضیت اور خانہ کعبہ کی عظمت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

"وَ فَرَضَ عَلَيْكُمْ حَجَّ بَيْتِهِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلَهُ قِبْلَةً لِلْأَنَامِ يَرِدُونَهُ وُرُودَ الْأَنْعَامِ وَ يَأْلَهُونَ إِلَيْهِ وُلُوهَ الْحَمَامِ وَ جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ عَلَامَةً لِتَوَاضُعِهِمْ لِعَظَمَتِهِ وَ إِذْعَانِهِمْ لِعِزَّتِهِ۔" (1)

یعنی: "اللہ نے اپنے گھر کا حج تم پر واجب کیا۔ جسے لوگوں کا قبلہ بنایا۔ جہاں لوگ اس طرح کھنچ کر آتے ہیں، جس طرح پیاسے حیوان پانی کی طرف۔ اور اس طرح وارفتگی سے بڑھتے ہیں,

جس طرح کبوتر اپنے آشیانوں کی جانب۔ اللہ جلّ شان نے اس کو اپنی عظمت کے سامنے ان کی فروتنی و عاجزی اور اپنی عزت کے اعتراف کا نشان بنایا ہے۔"

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں: خانہ کعبہ کے حج کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے فرض قرار دیا اور ساتھ ہی اسے قبلہ بھی بنایا ہے تاکہ پوری دنیا کہ لوگ اس کی طرف منہ کرکے نماز ادا کریں اور اسی طرح دیگر عبادات انجام دیں۔ جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ارشاد ہے:

"قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ۔" (2)

ترجمہ: "ہم آپ کو بار بار آسمان کی طرف منہ کرتے دیکھ رہے ہیں، سو اب ہم آپ کو اسی قبلے کی طرف پھیر دیتے ہیں، جسے آپ پسند کرتے ہیں، اب آپ اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کریں اور تم لوگ جہاں ہو اس کی طرف رخ کرو۔"

اللہ تعالیٰ نے اس گھر کو لوگوں کا قبلہ بنایا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کی تعمیر کا حکم دیا۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کا حج کرنے کے لیے لوگوں کو پکارنے کا حکم دیا، جس کے متعلق قرآن کریم میں اس طرح ارشاد ہے:

"وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ۔" (3)

ترجمہ: "اور لوگوں میں حج کے لیے اعلان کرو کہ لوگ آپ کے پاس دور راستوں سے پیدل چل کر اور کمزور اونٹوں پر سوار ہو کر آئیں۔"

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر مکمل کرکے لوگوں کو آواز دی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام لوگوں کی ارواح تک پہنچایا اور ان کی روحوں نے اس بلاوے پر لبیک کہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج لاکھوں لوگ حج کرنے خانہ کعبہ پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح تفسیر قمی میں ایک روایت میں اس طرح ارشاد ہے:

جب ابراہیم علیہ السلام خانہ کعبہ کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ لوگوں کو حج بیت اللہ کے لیے آواز دیں تو ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ یا رب میری آواز کو لوگوں تک کون پہنچائے گا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم آواز دو اس آواز کو پہنچانا ہمارا ذمہ ہے۔۔۔۔ لہٰذا ابراہیم علیہ نے کہا اے لوگو!

تمہارے اوپر بیت عتیق کا حج فرض کیا گیا ہے، پس تم اپنے رب کے حکم کو قبول کرو اور اس کا جواب دو، پس ساتوں سمندروں کے نیچے تک کی مخلوق نے لبیک کہی اسی طرح مشرق و مغرب کے درمیان یہاں تک کہ تمام زمین کے اطراف و اکناف سے لبیک کی صدا بلند ہوئی اور روحوں نے مردوں کے صلبوں سے اور ماؤں کے رحموں سے لبیک کی صدائیں بلند کیں۔ (4)

حجاج کرام کی تاریخ اور عظمت

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"وَ اخْتَارَ مِنْ خَلْقِهِ سُمَّاعاً أَجَابُوا إِلَيْهِ دَعْوَتَهُ وَ صَدَّقُوا كَلِمَتَهُ وَ وَقَفُوا مَوَاقِفَ أَنْبِيَائِهِ وَ تَشَبَّهُوا بِمَلَائِكَتِهِ الْمُطِيفِينَ بِعَرْشِهِ يُحْرِزُونَ الْأَرْبَاحَ فِي مَتْجَرِ عِبَادَتِهِ وَ يَتَبَادَرُونَ عِنْدَهُ مَوْعِدَ مَغْفِرَتِهِ۔" (5)

ترجمہ: "اُس نے اپنی مخلوق میں سے سننے والے لوگ چن لیے، جنہوں نے اس کی آواز پر لبیک کہا اور اس کے کلام کی تصدیق کی وہ انبیا کی جگہوں پر ٹھہرے۔ عرش پر طواف کرنے والے فرشتوں سے مشابہت اختیار کی۔ وہ اپنی عبادت کی تجارت گاہ میں منفعتوں کو سمیٹتے ہیں اور اس کی وعدہ گاہ مغفرت کی طرف بڑھتے ہیں۔"

اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبارَكاً وَ هُدىً لِلْعالَمِينَ۔ فِيهِ آياتٌ بَيِّناتٌ مَقامُ إِبْراهِيمَ وَ مَنْ دَخَلَهُ كانَ آمِناً وَ لِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطاعَ إِلَيْهِ سَبِيلاً وَ مَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعالَمِينَ۔" (6)

ترجمہ: "سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت) کے لیے بنایا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے، جو عالمین کے لیے بابرکت اور راہنما ہے۔ اس میں واضح نشانیاں ہیں (مثلا) مقام ابراہیم اور جو اس میں داخل ہوا وہ امان والا ہو گیا اور لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک جانے کی استطاعت

رکھتا ہو وہ اس گھر کا حج کرے اور جو کوئی اس سے انکار کرتا ہے تو اس کا اپنا نقصان ہے اللہ تو اہل عالم سے بے نیاز ہے۔"

اسی طرح امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک حدیث مروی ہے:

"قَالَ: "مَا خَلَقَ اللهُ۔ عَزَّوَ جَلَّ۔ بُقْعَةً فِي الْأَرْضِ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْهَا" ثُمَّ أَوْمَأَ بِيَدِهِ نَحْوَ الْكَعْبَةِ "وَ لَا أَكْرَمَ عَلَى اللهِ۔ عَزَّوَ جَلَّ۔ مِنْهَا لَهَا، حَرَّمَ اللهُ الْأَشْهُرَ الْحُرُمَ فِي كِتَابِهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضَ۔" (7)

یعنی: "اللہ تعالیٰ نے زمین میں کوئی ایسا حصہ نہیں خلق کیا جو خانہ کعبہ سے زیادہ اس کو محبوب ہو، اس کے بعد امامؑ نے خانہ کعبہ کی طرف اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا اور (فرمایا) نہ ہی کوئی جگہ اس سے زیادہ عزت والی ہے اللہ کے ہاں، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کے مہینوں کو حرام قرار دیا ہے اس دن سے جب سے اللہ نے آسمانوں اور زمین کو خلق کیا ہے۔"

اسلام کا پرچم اور پناہ گاہ

امیر المومنین علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

"جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالَى لِلْإِسْلَامِ عَلَماً وَ لِلْعَائِذِينَ حَرَماً۔" (8)

یعنی: "اللہ سبحانہ نے اس گھر کو اسلام کا نشان اور پناہ چاہنے والوں کے لیے حرم بنایا ہے۔"

حج کی فرضیت اور استطاعت

حضرت علی علیہ السلام حج کی فرضیت اور اس کی شرائط کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَرَضَ حَقَّهُ وَ أَوْجَبَ حَجَّهُ وَ كَتَبَ عَلَيْكُمْ وِفَادَتَهُ فَقَالَ سُبْحَانَهُ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَ مَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ۔" (9)

یعنی: "اس کا حج فرض اور ادائیگی حق کو واجب کیا ہے اور اس کی طرف راہ نور دی فرض کر دی ہے۔ چنانچہ اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ اللہ کا واجب الادا حق لوگوں پر یہ ہے کہ وہ خانہ کعبہ کا

حج کریں، جنہیں وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو اور جس نے کفر کیا تو جان لے کہ اللہ سارے جہان سے بے نیاز ہے۔"

حج کے فائدے

امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام حج کے فائدے بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"إِنَّ أَفْضَلَ مَا تَوَسَّلَ بِهِ الْمُتَوَسِّلُونَ إِلَى اللهِ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالَى ـــــ وَ حَجُّ الْبَيْتِ وَ اعْتِمَارُهُ فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَ يَرْحَضَانِ الذَّنْبَ۔" (10)

یعنی: "اللہ کی طرف وسیلہ ڈھونڈھنے والوں کے لیے بہترین وسیلہ ـــــــــ خانہ کعبہ کا حج اور عمرہ بجالانا ہے کہ وہ فقر کو دور کرتے ہیں اور اور گناہوں کو دھو دیتے ہیں۔"

اسی طرح ایک حدیث مبارکہ میں بھی بیان ہے:

"وَ حِجُّ الْبَيْتِ وَ الْعُمْرَةُ فَإِنَّهُمَا يَنْفِيَانِ الْفَقْرَ وَ يُكَفِّرَانِ الذَّنْبَ وَ يُوجِبَانِ الْجَنَّةَ۔" (11)

یعنی: "حج بیت اللہ اور عمرہ یہ دونوں فقر کو دور کرتے ہیں اور گناہوں کو دھو دیتے ہیں اور جنت کو واجب قرار دیتے ہیں۔"

اس جملے میں حضرت علی علیہ السلام نے حج اور عمرہ کے تین فائدے ذکر کیے ہیں، پہلا یہ ہے کہ یہ فقر کو دور کرتے ہیں، دوسرا یہ ہے کہ یہ گناہوں کو دور کرتے ہیں، تیسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ جنت کو واجب قرار دیتے ہیں۔

حج کا اہتمام کرنا

مولائے متقیان امیر المومنین علیہ السلام مکہ کے والی اور گورنر کو خصوصی ہدایت دیتے ہوئے لوگوں کے لیے حج کا اہتمام کرنے کا حکم دیتے ہیں:

"أَمَّا بَعْدُ فَأَقِمْ لِلنَّاسِ الْحَجَّ وَ ذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللهِ۔" (12)

یعنی: "لوگوں کے لیے حج کے قیام کا سروسامان کرو اور اللہ تعالیٰ کے یادگار دنوں کی یاد دلاؤ۔"

اسی طرح مزید انہیں فرماتے ہیں:

''وَ مُرْ أَهْلَ مَكَّةَ أَلَّا يَأْخُذُوا مِنْ سَاكِنٍ أَجْراً فَإِنَّ اللهَ سُبْحَانَهُ يَقُولُ سَواءً الْعاكِفُ فِيهِ وَ الْبادِ فَالْعَاكِفُ الْمُقِيمُ بِهِ وَ الْبَادِي الَّذِي يَحُجُّ إِلَيْهِ مِنْ غَيْرِ أَهْلِهِ۔'' (13)

ترجمہ: ''مکہ والوں کو حکم دو کہ وہ باہر سے آکر ٹھہرنے والوں سے کرایہ نہ لیں، کیونکہ اللہ سبحانہ فرماتا ہے کہ اس میں عاکف اور بادی یکساں ہیں۔ عاکف وہ ہے جو اس میں مقیم ہو اور بادی وہ ہے جو باہر سے حج کے لیے آیا ہے۔''

اس حکم سے واضح ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ آنے والے حجاج کرام سے ٹھہرنے کے لیے کرایہ لینا جائز نہیں ہے۔ ساتھ قرآن کریم کی آیت سے دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس شہر مکہ مکرمہ میں یہاں رہائشی اور مسافر دونوں کو برابری حاصل ہے لہٰذا دور سے آنے والے لوگوں سے رہائش کا کرایہ نہ لیا جائے۔ اسی طرح نبی کریم صلی للہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''وَ عَنْهُ، عَنْ جَعْفَرٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَلِيٍّ عَلَيْهِ السَّلَامُ: أَنَّهُ كَرِهَ إِجَارَةَ بُيُوتِ مَكَّةَ وَ قَرَأَ سَواءً الْعاكِفُ فِيهِ وَ الْباد۔'' (14)

یعنی: ''حضرت علی علیہ السلام بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ کے گھروں کو اجرت پر دینا ناپسند کیا کرتے تھے اور اس آیت کی سَواءً الْعاكِفُ فِيهِ وَ الْباد تلاوت کرتے تھے۔''

ضعفاء کا جہاد

امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے حج کو ضعفاء کا جہاد قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے:

''وَ الْحَجُّ جِهَادُ كُلِّ ضَعِيفٍ۔'' (15) یعنی: ''حج ہر کمزور کا جہاد ہے۔''

اسی طرح کافی کی ایک حدیث میں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے:

''عَلِيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ عَنْ أَبِيهِ عَنِ ابْنِ أَبِي عُمَيْرٍ عَنْ جُنْدَبٍ عَنْ أَبِي عَبْدِ اللهِ ع قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الْحَجُّ جِهَادُ الضَّعِيف۔'' (16)

یعنی: ''امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حج ضعیف کا جہاد ہے۔''

قربانی

حضرت علی علیہ السلام قربانی کے جانور کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

"وَ مِنْ تَمَامِ الْأُضْحِيَّةِ اسْتِشْرَافُ أُذُنِهَا وَ سَلَامَةُ عَيْنِهَا فَإِذَا سَلِمَتِ الْأُذُنُ وَ الْعَيْنُ سَلِمَتِ الْأُضْحِيَّةُ وَ تَمَّتْ وَ لَوْ كَانَتْ عَضْبَاءَ الْقَرْنِ تَجُرُّ رِجْلَهَا إِلَى الْمَنْسَكِ۔" (17)

یعنی: "قربانی کے جانور کا کمال یہ ہے کہ اس کے کان بلند ہوں اور آنکھیں سلامت ہوں کہ اگر کان اور آنکھ سلامت ہیں تو گویا قربانی بھی سالم اور مکمل ہے، چاہے اس کے سینگ ٹوٹے ہوئے ہوں اور پیر گھسیٹ کر اپنے کو قربان گاہ تک لے جائے۔"

حج کا فلسفہ

حضرت علی علیہ السلام مختلف اسلامی احکام کے فلسفے کو بیان کرتے ہوئے حج کے بارے میں فرماتے ہیں:

"فَرَضَ اللهُ۔۔۔۔وَ الْحَجَّ تَقْرِبَةً (تَقْوِيَةً) لِلدِّينِ۔" (18)

یعنی: "اللہ تعالیٰ نے حج کو فرض کیا پیروان دین کو ایک دوسرے سے نزدیک کرنے کے لیے (دین کو تقویت پہنچانے کے لیے۔)"

حج مسلمانوں کے ایک دوسرے سے قریب ہونے اور تمام مسلمانوں تک ان کی آواز پہنچانے کے لیے ہے۔ اتنے سارے قلوب کو جو چیز آپس میں جوڑتی ہے وہ، وہی پیغام ہے جو پہلی بار اس سرزمین سے نکلا تھا اور دنیا کے طول و عرض اور پوری تاریخ تک پہنچ گیا تھا، اور وہ تھا توحید اور اتحاد کا پیغام، خدا کی توحید اور امت کا اتحاد۔ توحید، طاغوتوں، سامراجیوں اور طاقت اور دھوکے سے کام لینے والوں کی خدائی کا انکار ہے اور اتحاد مسلمانوں کی عزت و اقتدار کا مظہر۔ حج کے دوران کسی بھی تحریر یا تقریر سے زیادہ اس جاوداں پیغام کو ہر سال اس عظیم اجتماع کی صورت میں دہرایا اور پورے عالم اسلام تک پہنچایا جاتا ہے۔

پس حج کا مقصد یہ ہے کہ حلقہ بگوشان اسلام اطراف و اکناف عالم سے سمٹ کر ایک مرکز پر جمع ہوں تاکہ اس عالمی اجتماع سے اسلام کی عظمت کا مظاہرہ ہو اور اللہ کی پرستش و عبادت کا ولولہ تازہ اور آپس میں روابط کے قائم کرنے کا موقع حاصل ہو۔ اس کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد رب العزت ہے:

”لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ۔“ (19)

ترجمہ: ”تاکہ اپنے فائدے کے کاموں کے لئے حاضر ہوں اور (قربانی کے) ایام معلوم میں چہار پایایوں (کے ذبح کے وقت) جو خدا نے ان کو دیے ہیں ان پر خدا کا نام لیں اس میں سے تم بھی کھاؤ اور فقیر درماندہ کو بھی کھلاؤ۔“

حج کا فلسفہ دین کی تقویت (یا پیروان دین کو ایک دوسرے سے نزدیک کرنا) ہے۔ بہر حال ان دونوں میں سے ایک مقصود ہے۔ اگر اس بیان کا مطلب یہ ہو کہ حج کا فلسفہ دین کو مضبوط کرنا ہے تو اس کا معنی یہ بنے گا کہ حج کے عظیم اجتماع کے ذریعے مسلمانوں کے ایک دوسرے سے تعلقات مزید مضبوط ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں کا ایمان مزید پکا ہو جاتا ہے، اس طرح سے اسلام اور زیادہ مضبوط اور طاقتور ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر مولائے متقیان علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا مقصود یہ ہو کہ حج کا فلسفہ دین کو نزدیک کرنا ہے تو اس کا معنی یہ ہوگا کہ حج کا مقصد مسلمانوں کے قلوب کو ایک دوسرے سے نزدیک کرنا ہے، جس کا نتیجہ بھی اسلام کی مضبوطی اور طاقت ہے۔

اسی طرح امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام ایک اور مقام پر حج کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:

”جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالَى لِلْإِسْلَامِ عَلَماً۔“ (20)

یعنی: ”اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے کعبہ کو اسلام کا پرچم قرار دیا ہے۔“

قدیم الایام سے معمول ہے کہ ایک دوسرے سے جنگ کرنے کے دوران ہر گروہ اپنا ایک مخصوص پرچم بھی ساتھ رکھتا تھا۔ یہ پرچم ان کی بقا، آزادی اور مزاحمت کی علامت جانا جاتا تھا۔ اس پرچم کے اونچا ہونے کا مطلب اس گروہ کا اجتماعی اعتبار سے زندہ ہونا اور اس کے سرنگوں ہونے کا مطلب اس کی شکست ہوتی تھی۔ گروہ کا سب سے زیادہ بہادر اور شجاع انسان اس پرچم کو اٹھانے کی ذمہ داری سنبھالتا تھا۔ گروہ کے دلیر افراد اس پرچم کے ارد گرد جمع ہوتے تھے تاکہ اس کو گرنے سے بچائے رکھیں۔ لیکن اس کے

برعکس، دشمن کی ساری کوشش یہ ہوتی تھی کہ ان کے پرچم کو سرنگوں کرے۔ پرچم ایک مقدس اور قابل احترام چیز تھی۔

آج بھی پرچم قوموں اور ملکوں کی خود مختار حیثیت، آزادی اور اتحاد کی علامت ہے۔ ہر ملک کا ایک پرچم ہے جس کو مقدس جانا جاتا ہے اور اس پر قسم بھی کھائی جاتی ہے۔ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو اسلام کا پرچم قرار دیا ہے، یعنی اسی طرح جیسے ایک پرچم کسی معاشرے کے اتحاد اور باہمی تعاون کی علامت ہوتا ہے اور اس کا سربلند ہونا ان کے زندہ ہونے کی نشانی ہے، خانہ کعبہ بھی اسلام کی نسبت وہی مقام رکھتا ہے کہ جب تک یہ بلند ہے اور موجود ہے اس وقت تک اسلام باقی ہے اور اسی کی وجہ سے عالم اسلام ایک دوسرے کے ساتھ جڑا ہوا ہے، یعنی تمام مسلمانوں کے اتحاد کی علامت ہے۔

اسی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام حج کے اجتماع اور لوگوں کے ایک دوسرے کے قریب ہونے کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

"عَنْ هِشَامِ بْنِ الْحَكَمِ قَالَ: سَأَلْتُ أَبَا عَبْدِ اللهِ(ع) فَقُلْتُ لَهُ مَا الْعِلَّةُ الَّتِي مِنْ أَجْلِهَا كَلَّفَ اللهُ الْعِبَادَ الْحَجَّ وَ الطَّوَافَ بِالْبَيْتِ فَقَالَ إِنَّ اللهَ خَلَقَ الْخَلْقَ إِلَى أَنْ قَالَ وَ أَمَرَهُمْ بِمَا يَكُونُ مِنْ أَمْرِ الطَّاعَةِ فِي الدِّينِ وَ مَصْلَحَتِهِمْ مِنْ أَمْرِ دُنْيَاهُمْ فَجَعَلَ فِيهِ الِاجْتِمَاعَ مِنَ الشَّرْقِ وَ الْغَرْبِ لِيَتَعَارَفُوا۔" (21)

یعنی: "ہشام بیان کرتے ہیں کہ اس نے امام ابو عبد اللہ جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو حج بیت اللہ اور طواف کا مکلّف کیوں بنایا ہے، تو امام علیہ السلام نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا اور ان کو دینی معاملات میں اطاعت کا حکم دیا اور اسی طرح ان کو دنیا کی مصلحت کے مطابق امور کی انجام دہی کا حکم دیا اور خداوند عالم نے یہ مقرر فرمایا ہے کہ دنیا کے مشرقی اور مغربی حصوں سے تمام افراد وہاں پر جمع ہوں تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔"

پس اس حدیث سے واضح ہو رہا ہے کہ حج کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ دنیا کے اکناف و اطراف سے لوگ آکر خانہ کعبہ کا طواف کریں اور ایک دوسرے سے متعارف ہوں۔ آج کل ایک اچھی رسم یہ ہے کہ وہ افراد جو کسی پروگرام یا اجتماع میں پہلی بار ایک دوسرے سے آشنا ہوتے ہیں، آپس میں وزیٹنگ کارڈز کا تبادلہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کا نام اور ایڈریس یادداشت کرتے ہیں۔ یہ کام بعد میں مزید آشنائی کا سبب بن جاتا ہے اور باعث بنتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مصروفیات سے آگاہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح سے ان کے تعلقات مزید مضبوط ہو جاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام نے چودہ سو سال پہلے حج کے ذریعے ان کاموں کا راستہ فراہم کر دیا تھا اور حج پر ایک دوسرے سے آشنا ہونے کی تاکید فرمائی ہے۔

حج اور اجتماعی وحدت

حج کے اثرات میں سے ایک اجتماعی اتحاد اور ہم آہنگی ہے۔ ایک شخص کے اکیلے عرفات جا کر دعا کرنے اور ہزاروں افراد کے اکٹھے ہو کر جانے میں فرق ہے۔ انسان کی روح میں اجتماع کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے متعلق ایک حدیث میں ارشاد ہوتا ہے:

"عِدَّةٌ مِنْ أَصْحَابِنَا عَنْ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنِ الْحُسَيْنِ بْنِ سَعِيدٍ عَنْ فَضَالَةَ بْنِ أَيُّوبَ عَنْ أَبِي الْمَغْرَاءِ عَنْ أَبِي بَصِيرٍ عَنْ أَبِي عَبْدِ اللهِ ع قَالَ: لَا يَزَالُ الدِّينُ قَائِماً مَا قَامَتِ الْكَعْبَةُ۔" (22)

یعنی: "امام ابو عبد اللہ جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: دین اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کعبہ قائم ہوگا، یعنی جب تک کعبہ موجود ہے اسلام بھی قائم و دائم ہے، جب تک حج زندہ اور باقی ہے اسلام بھی زندہ اور باقی ہے۔"

اسلام نفسیاتی حوالے سے ایسے مذہبی اور معنوی ماحول کو اہمیت دیتا ہے جو انسان کے اندر چھپے ہوئے احساسات کے بیدار ہونے کا سبب بنتا ہے۔ سوشل سائنس کے علماء کے نزدیک "محاکات" صرف مادی حیثیت رکھتا ہے اور محض ایک رد عمل ہے، لیکن یہ دراصل روح میں موجود ایک صلاحیت ہے، جس کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ صرف بیدار ہونے کی صورت میں ہی یہ رد عمل کئی سو گنا طاقتور ہو جاتا

ہے۔ پس اسلام ہمیں یعنی مختلف قوموں کو جو نہ ایک نسل سے ہیں، نہ ایک زبان بولتے ہیں، نہ ایک رنگ کے ہیں اور نہ ایک حکومت اور قومیت رکھتے ہیں ایک سرزمین پر انتہائی روحانی آمادگی کے ساتھ جمع کرتا ہے۔ یہ ایک بے مثال اجتماع ہے، ایک ایسا اجتماع جو تعداد کے حوالے سے کم نظیر یا شاید بے نظیر ہو، لیکن کوالٹی کے لحاظ سے یقیناً بے نظیر ہے۔ کیونکہ یہ بالکل نیچرل ہے اور اس کے پیچھے کسی قسم کی زبردستی نہیں ہے۔ یہ ایسا اجتماع ہے جو کسی لالچ کے بغیر ہے، بلکہ ہر لالچ کو ترک کرنے کے بعد ہے، ایک ایسا اجتماع جو عیش و عشرت اور تفریح کی خاطر بھی نہیں ہے۔ آج اس کی مشکلات اگرچہ کافی حد تک کم ہو گئی ہیں، لیکن پھر بھی مشکلات کے ہمراہ ہے۔ ایک ایسا اجتماع ہے جس میں کم از کم عارضی طور پر ذاتی افتخارات اور انا پرستی کو ترک کر دیا جاتا ہے۔ سب افراد ایک سوچ اور ایک ذکر اور ایک لباس اور ایک عمل کے ساتھ ایک راستے پر قدم اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اسلام خود بھی مسلمانوں کی وحدت کا خواہاں ہے اور حج کا ایک بڑا مقصد بھی اسلامی وحدت ہے۔ پہلا دعویٰ اس آیہ شریفہ سے ثابت ہوتا ہے:

"وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا۔" (23)

ترجمہ: "اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔"

یہ آیت کریمہ واضح طور پر مسلمانوں کو اتحاد و وحدت کی دعوت دے رہی ہے اور ان کو اختلاف اور تفرقہ بازی سے روک رہی ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَ اخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔" (24)

ترجمہ: "اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو واضح دلائل آجانے کے بعد بٹ گئے اور اختلاف کا شکار ہوئے اور ایسے لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔"

"وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ۔" (25)

ترجمہ: ''اور آپس میں نزاع نہ کرو ورنہ ناکام رہوگے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔''

اس آیت کریمہ میں اختلاف کے نقصانات بتائے گئے ہیں کہ اس سے تم ناکام ہو جاوگے اور تمہاری طاقت ختم ہو جائے گی۔اسی طرح دوسرا دعویٰ امام علی علیہ السلام کے اس قول سے ثابت ہوتا ہے کہ: ''جَعَلَهُ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالَى لِلْإِسْلَامِ عَلَماً۔'' کہ '' خدا نے حج کو اسلام کا پرچم قرار دیا ہے تاکہ تمام مسلمان خود کو اس کے زیر سایہ جمع کریں۔ حج ایسا پرچم ہے جو تمام مسلمانوں کو اپنے زیر سایہ اکٹھا کرنا چاہتا ہے۔ امیر المومنین امام علی علیہ السلام نے اسی طرح فرمایا''والحج تقوية للدين'' حج کا فلسفہ دین کو مضبوط کرنا ہے۔ دین کو اس طرح سے مضبوط کرنا کہ مسلمان حج پر ایک دوسرے سے آشنا ہوتے ہیں اور ان کی دوستی زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے،اس سے ان کو طاقت و قوت ملتی ہے، جس کی وجہ سے اسلام کو طاقت ملتی ہے اور اسلام مضبوط ہوتا ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱

2۔ سورہ البقرہ، آیت نمبر ۱۴۴

3۔ سورۃ الحج: ۲۷

4۔ تفسیر قمی، جلد ۲، صفحہ ۸۴

5۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱

6۔ البقرہ: ۹۶۔۹۷

7۔ الکلینی محمد یعقوب (المتوفی: ۳۲۹ھ ق) الکافی، محقق / مصحح: غفاری علی اکبر و آخوندی، محمد، بَابُ فَضْلِ النَّظَرِ إِلَى الْكَعْبَةِ، طبع: دار الکتب الاسلامیہ سال ۱۴۰۷ھ ق، جلد ۴، صفحہ ۲۴۰، تہران ایران

8۔ نہج البلاغہ، خطبہ ۱

9۔ نہج البلاغہ، خطبہ

10۔ نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۸
11۔ابن شعبہ حرانی، حسن بن علی (المتوفی: ۴ھ) تحف العقول، محقق / مصحح: غفاری، علی اکبر، ناشر: جامعہ مدرسین ، سال: 1404 / 1363ق، قم ایران
12۔ نہج البلاغہ ، مکتوب ۶۷
13۔ایضا
14۔ حمیری، عبداللہ بن جعفر (المتوفی: ۳ھ) قرب الاسناد، ناشر: مؤسسۃ آل البیت علیہم السلام، سال: 1413ق، قم ایران
15۔ نہج البلاغہ ، قول 136
16۔الکافی، جلد ۴، صفحہ ۲۵۹
17۔ نہج البلاغہ ، خطبہ ۵۳
18۔ نہج البلاغہ ، قول ۵۲۵
19۔الحج: ۲۸
20۔ نہج البلاغہ ، خطبہ ۱
21۔وسائل الشیعۃ، جلد ۱۱، صفحہ : ۱۴
22۔الکافی، جلد ۴، صفحہ ۲۷۱
23۔آل عمران: ۱۰۳
24۔آل عمران: ۱۰۵
25۔الانفال: ۴۶

کربلا، خودی کی سربلندی اور انسانی کرامت کی معراج

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین
sheikh.hasnain26060@gmail.com

کلیدی کلمات: کربلا، خودی، خدائی، کرامت، عشقِ الٰہی، حضرت امام حسین علیہ السلام

خلاصہ

واقعۂ کربلا ایک ایسا بابرکت شجر ہے جو ہر دَور کے انسانوں کو اُن کے حالات و ضروریات کے مطابق ہدایت کا عظیم ثمر عطا کرتا ہے۔ البتہ ہر دور کے انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ کربلا کو ایسے زاویوں سے دیکھے جو اس کے سامنے کربلا کی نئی تصویر اور نیا رُخ پیش کریں۔ زیرِ نظر مقالہ میں کربلا کے واقعہ کو انسانی کرامت اور خودی کی سربلندی کے اُفق سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقالہ کے مطابق، اللہ تعالیٰ نے جو خودی اور کرامت، انسان کو عطا کی ہے، وہ کائنات کی کسی مخلوق کو عطا نہیں کی۔ انسانی خودی، خدائی سے تشکیل پاتی ہے اور حقیقی خودی میں خدائی پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر انسان خودی کے وقار کا خیال نہ رکھے اور اِسے پَست دنیا کے بدلے بیچ ڈالے تو یہ انسانی کرامت کو گنوانا اور انسانیّت کے مقام سے گر کر حیوانیّت کے درجہ تک سقوط کے مترادف ہے۔

اگر اس تناظر میں کربلا کے واقعہ کا مشاہدہ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام اور آپ کے اصحاب نے میدان کربلا میں انسانی نفس کی بلندیوں کی وہ چوٹی سر کی جس تک عام انسانوں کے مرغِ تخیّل کی رسائی ممکن نہیں۔ اہلِ کربلا کی خودی عشقِ الٰہی کی غیرت سے اتنی محکم تھی کہ انہوں نے ہر گز ذلّت قبول نہ کی اور عزّت کی موت کو ذلّت کی زندگی پر ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی خودی میں ڈوب کر زندۂ جاوید ہوئے اور جریدۂ عالم پر اُن کا دوام ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گیا۔

کربلا، شجرۂ طیّبہ

واقعۂ کربلا کا شمار اُن حقائق میں سے ہوتا ہے جو ہر دَور میں، اُس دور کے تقاضوں کے مطابق، اپنی تفسیر خود پیش کرتے ہیں۔ یہ بابرکت شجر ہر دَور کے انسانوں کو اُن کے حالات و ضروریات کے مطابق ہدایت کا عظیم ثمر عطا کرتا ہے۔ بے شک، کربلا قرآن کریم کی اِس آیۂ مجیدہ کا بہترین مصداق ہے:

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ
تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (1)

یعنی: "آیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے پاکیزہ کلمہ کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے؛ کہ یہ، اُس پاکیزہ درخت کی مانند ہے جس کی جڑ (زمین میں مضبوطی سے) گڑھی ہے اور شاخیں آسمان میں ہیں۔ وہ (درخت) اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل دے رہا ہے؛ اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔"

لہٰذا کربلا وہ پاکیزہ درخت ہے جس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں پیوست اور شاخیں ثریا کی بلندیوں کو چھو رہی ہیں اور یہ درخت ہمیشہ سایہ دار اور ہر وقت پھل دے رہا ہے۔ کربلا، جہاں انسانی احساسات و عواطف رکھنے والوں کے لئے تصویرِ غم ہے، وہاں اہلِ عرفان کے لئے عبد و معبود کے درمیان امر اور امتثال کا انتہائی حسین، جمالیاتی منظر ہے۔ یہ، دین داروں کے لئے معبود کی بارگاہ میں ایک عابد کا مخلصانہ سجدۂ شکر بجالانے کی عالی ترین مثال اور اہلِ دنیا کے لئے دنیاداری کے سنہری اصولوں کا مرقّع ہے۔

کربلا، سیاست دانوں کے لئے رہنما اور عوام کے لئے ہدایت کا روشن چراغ ہے۔ کربلا، انسانی حقوق کے علمبرداروں کے لئے انسانی حقوق کی پاسداری کا عظیم شاہکار اور اخلاقی اقدار کا دَم بھرنے والوں کے لئے اخلاقی ضابطوں کی ہر حال میں پابندی کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ کربلا، خالقِ کائنات کے حقِ اطاعت کی ادائیگی کی عظیم الشان مثال اور سیر و سلوک کی وادیوں میں سفر کرنے والوں کے لئے انقطاع الی اللہ و قرب الی اللہ کی معراج ہے۔

غرضیکہ، کربلا کو جس زاویے سے دیکھا جائے، یہ ایک نیا منظر، نئی جہت اور نئی روشنی عطا کرتی ہے۔ لیکن جب واقعۂ کربلا پر نظر دوڑانے والے، اکثر اِسے فقط ایک ہی زاویے سے دیکھتے ہیں تو کربلا بھی اُن کے

سامنے اپنی تجلیّات میں سے محض ایک ہی تجلّی پیش کرتی ہے۔ جو لوگ کربلا کو ہمیشہ انسانی جذبات و احساسات اور مصائب و مشکلات کے منظر سے دیکھتے ہیں، کربلا اُن کے سامنے ایک رونے رُلانے کی پاکیزہ داستان اور انسانی احساس کی پاکیزگی، طہارت، عروج اور کمال کی تجلّی کے سوا کوئی اور تجلّی پیش نہیں کرتی۔ ایسے لوگوں کے سامنے کربلا کے کئی پہلو پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔

بالکل ایک ایسے انسان کی طرح کہ جو فنِّ تعمیر کے ایک عظیم الشان شاہکار، بہت بڑے قلعے کے محض ایک کونے میں بیٹھا، اُسی کونے کے فنِّ تعمیر کا مشاہدہ کر رہا ہو اور اُس قلعہ کے دیگر حصّوں کے تعمیری شاہکار کے مشاہدے سے بالکل غافل ہو۔ جب تک اُسے قلعے کے ایک کونے سے نکال کر مشاہدے اور دید کے نئے زاویے مہیا نہ کر دیے جائیں، وہ فنِّ تعمیر کے اس شاہکار کی کثیر الجہات رعنائیوں اور گہرائیوں کا ادراک نہیں کر سکتا۔

اسی طرح جو لوگ کربلا کو فقط ایک داستانِ غم کے زاویہ سے دیکھتے ہیں، وہ کربلا کے کئی دیگر گوشوں کی عظمت اور گہرائی سے غافل رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جہاں ہم کربلا کو انسانی عاطفے اور احساس کی معراج کے طور پر دیکھیں، کربلا والوں کے مصائب اور غم پر روئیں، رُلائیں، وہاں تحت الثریٰ سے عرشِ معلّٰی تک پھیلی اس عظیم حقیقت کا دوسرے زاویوں سے بھی ضرور مشاہدہ کریں۔

کربلا کو جہاں رُلانے کے لئے ایک داستانِ غم کے طور پر لیا جاتا ہے، وہاں اسے شجاعت و بہادری کے ایک عظیم معرکہ کے طور پر بھی لیا جائے۔ جہاں اسے خاندان پیغمبر اکرم ﷺ کی اسیری کی تاریخ کے طور پر لیا جاتا ہے، وہاں اسے حماسہ و عرفان کی ایک عظیم داستان کے طور پر بھی لیا جائے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم کربلا کو کبھی قرآنی آیات کی روشنی میں، تو کبھی نبوی ارشادات کے تناظر میں، کبھی انسانی سیاست کے زاویہ سے، تو کبھی فلسفہ و عرفان کے زاویے سے، کبھی احساس و عاطفہ کے منظر سے، تو کبھی علمِ اخلاق کے زاویہ سے دیکھیں۔ یقیناً کربلا، ہر نئے زاویے سے ہمیں نئی روشنی عطا کرے گی۔

البتہ کربلا کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے انسان کو اُن جہات اور زاویوں سے آشنا کیا جائے اور اُسے وہاں لا کھڑا کیا جائے جہاں سے وہ کربلا کی کوئی نئی تصویر اور نیا رُخ مشاہدہ کر سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک مقالہ نگار، مصنّف، مقرر اور استاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مخاطبین کی رہنمائی فرمائے اور وہ علمی، فکری مقدّمات فراہم کر دے جو اُنہیں کربلا کے مشاہدہ کے

جدید زاویے عطا کریں۔ میں نے اس مقالہ میں مقدور بھر کوشش کی ہے کہ اپنے قارئین کو کربلا کے مشاہدہ کا ایک جدید زاویہ مہیّا کر دوں۔ یہ انسانی کرامت اور خودی کی بلندیوں کا اُفق اور زاویہ ہے۔ ملاحظہ فرمایئے! کربلا اِس زاویے سے ہمارے سامنے کیا تجلّی پیش کرتی ہے۔

خدائی، خودی کا راز

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نفس عطا کیا ہے، وہ کسی ذی نفس کو عطا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جو خودی اور کرامت، انسان کو عطا کی ہے، وہ کائنات کی کسی مخلوق کو عطا نہیں کی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ
مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (2)

یعنی: "اور بے شک ہم نے آدم کی اولاد کو کرامت بخشی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سواری عطا کی اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا اور ہم نے انہیں اکثر مخلوقات پر، جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے، فضیلت دے کر برتر بنا دیا۔"

انسانی نفس کی کرامت کا یہ عالم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے اور اسے اپنی معرفت کا باب قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَنَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰهَا'' (3) یعنی: ''اور نفس کی قسم! اور اس ذات کی قسم جس نے نفس کو معتدل بنایا!'' دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے:

''سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ
اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَ لَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ'' (4)

یعنی: ''ہم اپنی نشانیاں انہیں عنقریب آفاق میں اور خود ان کے اپنے ''نفوس'' میں دکھائیں گے؛ تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ وہ حق ہے؛ آیا کافی نہیں کہ تیرا پروردگار ہر شئے پر گواہ ہے؟''

تیسری جگہ ارشاد ہے: وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (5) یعنی: ''اور زمین میں اہل یقین کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے نفوس میں؛ آیا دیکھتے نہیں ہو؟!''

حضرت رسول اکرم ﷺ سے منسوب ایک حدیث کے مطابق آپ ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ، عَرَفَ رَبَّهُ''(6) یعنی: '' جس نے اپنے آپ کو پہچانا، اُس نے اپنے خدا کو پہچانا۔'' یا حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے: ''مَعْرِفَةُ النَّفْسِ أَنْفَعُ الْمَعَارِفِ''(7) یعنی: '' نفس کی معرفت، سب سے زیادہ نفع بخش معرفت ہے۔''

بنابریں، بقول حکیم الامّت، علامہ محمد اقبال، خودی کا سرّ، لا الٰہ الّا اللہ" یا توحید میں پوشیدہ ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ خودی، خدائی میں اور خودی میں خدائی پائی جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے ایک اور مقام پر کیا خوب کہا ہے

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی　　خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش　　خودی کی زد میں ہے ساری خدائی (8)

اسی لئے خود شناسی، خدا شناسی کا سنگِ بنیاد ہے۔ خداشناس انسانی کرامتوں کی معراج پر فائز ہوتا ہے اور وہ کسی صورت اپنی خودی نہیں بیچتا۔ جب ایک انسان کے اندر نفس کی کرامت پیدا ہو جائے تو پھر وہ تمام انسانی فضائل اور خلاقی خوبیوں سے مزین ہوتا ہے۔ ایسا انسان دنیاوی خواہشات، فانی لذّات اور حیوانی غرائز کو نظر انداز کرتے ہوئے اعلیٰ اخلاقی اصولوں کی پاسداری کو ترجیح دیتا ہے۔ جیسا کہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں: ''مَنْ كَرُمَتْ عَلَيْهِ نَفْسُهُ هَانَتْ عَلَيْهِ شَهَوَاتُه''(9) یعنی: '' جس شخص کے نفس میں کرامت آ جائے، اُس پر شہوتیں بے ارزش ہو جاتی ہیں۔'' پس ایک انسان کا سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ وہ انسانی کرامت کی معراج پر فائز ہو اور اُس کی خودی اتنی سربلند ہو کہ اُس کا سر، درِ باطل پر جھکایا نہ جا سکے۔(10)

خدافراموشی، بے خودی

اوپر بیان شدہ مطلب کے بالکل برعکس، انسانی خودی کے وقار کا خیال نہ رکھنا، اِسے کوڑیوں کے عوض بیچ دینا اور انسانی کرامت کو گنوا دینا، انسانیّت کے مقام سے گر کر حیوانیّت کے درجہ تک سقوط ہے۔ یہ امر

انسان کو حیوان سے بھی پست تر بنا دیتا ہے۔ در حقیقت، جب انسان اپنے خدا سے غافل ہو جائے، تو اُس کی خدا فراموشی، خودی، بے خودی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی لئے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ" (11)

یعنی: "ان لوگوں کی مانند نہ بن جاؤ جنہوں نے خدا کو بھلا دیا؛ تو خدا نے انہیں ان کے "نفس" بھلا دیے۔"

اس آیۂ مجیدہ کا سبق یہی ہے کہ انسان، انسانیّت کے جوہر کی حفاظت سے کبھی غفلت نہ برتے۔ اور ایسا تب ممکن ہے جب انسان خدا سے غافل نہ ہو۔ اس نکتہ کی ترجمانی میں علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

نگہ پیدا کر اے غافل! تجلّی عینِ فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا!

لہٰذا جب ایک انسان خدا کو بھول کر دنیا طلبی اور دنیا پرستی کے بھنور میں پھنس جاتا ہے تو اپنی خودی گنوا دیتا ہے اور اُس کے سر سے انسانی کرامت کا تاج اتر جاتا ہے۔ یہ دُنیا، جس کا معنی ہی " گھٹیا" ہے، اگر انسان کے نفس کی قیمت قرار پا جائے تو یہ انسان کے لئے بہت بڑا خسارے کا سودا ہے۔ اسی لئے حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

" أَكْرِمْ نَفْسَكَ عَنْ كُلِّ دَنِيَّةٍ وَإِنْ سَاقَتْكَ إِلَى الرَّغَائِبِ فَإِنَّكَ لَنْ تَعْتَاضَ بِمَا تُبْذِلُ مِنْ نَفْسِكَ عِوَضاً"

یعنی: "اپنے نفس کو ہر پستی سے بچاؤ! خواہ تمہیں رغائب کی طرف ہی کیوں نہ بلائے؛ یاد رکھیے کہ اگر تم نے نفس کو کھو دیا تو پھر کوئی چیز اس کا نعم البدل نہیں بن سکتی۔" (12)

یقیناً دنیا کی کوئی چیز، کوئی منصب و مقام اور مملکت و ریاست، انسانی کرامت اور خودی کی قیمت نہیں بن سکتے۔ جیسا کہ حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ یہ اشعار پڑھتے تھے:

أُثَامِنُ بِالنَّفْسِ النَّفِيسَةِ رَبَّهَا　　وَلَيْسَ لَهَا فِي الْخَلْقِ كُلِّهِمْ ثَمَنٌ

بِهَا يُشْتَرَى الْجَنَّاتُ إِنْ أَنَا　　بِعْتُهَا بِشَيْءٍ سِوِيهَا فَإِنَّ ذَلِكَ غَبَنٌ (13)

یعنی: " میرے قیمتی نفس کی قیمت اس کا پروردگار ہی ہے اور اس کے علاوہ پوری کائنات میں کوئی چیز میرے نفس کی قیمت قرار نہیں دی جا سکتی۔ اس نفس کے ذریعے تو جنتیں خریدی جاتی ہیں اور اگر میں اسے اس سے کم قیمت پر بیچ دوں تو پھر یقیناً یہ خسارے کا سودا ہے۔"

پس اگر انسان اپنے نفس کو کرامت کا تاج نہ پہنا سکے تو اخلاقی پستیوں میں گر جاتا ہے۔ جو انسان جو اپنے نفس کی کرامت کا قائل نہ ہو، وہ تمام اخلاقی اقدار کو بڑی دیدہ دلیری سے پامال کر دیتا ہے اور دنیاوی آرام و آسائش اور ہوائے نفس کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔اس مطلب کی طرف حضرت علی علیہ السلام نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

"مَنْ هَانَتْ عَلَيْهِ نَفْسُهُ فَلَا تَأْمَنَّ شَرَّهُ" (14)

یعنی: "جس شخص کی نظر میں اس کے نفس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو، اس کے شر سے خود کو محفوظ نہ سمجھو۔" دراصل، بے دینی، غیر اخلاقی کام اور گھٹیا حرکت، انسانی نفس کی کرامت کے خلاف اور انسانی خودی کی تذلیل اور خواری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، والدین کی نافرمانی، جھوٹ، فریب اور مکّاری جیسی تمام اخلاقی برائیاں، انسانیّت کی معراج سے حیوانیّت کی پستیوں میں سقوط ہیں۔

کیونکہ انسان جس چیز کا طالب ہوتا ہے، وہ چیز اُس کی شخصیّت کا جزو بن جاتی ہے۔ اگر ایک انسان اللہ تعالیٰ کی مشیّت کا طالب ہو تو اُس کی خودی میں خدائی عنصر غالب آ جاتا ہے اور اگر انسان دنیاوی مال و متاع، مقامات اور اشیاء کا طالب ہو جائے تو اُس کی شخصیّت میں پستی اور گھٹیا پن آ جاتا ہے۔ جیسا کہ سرکار انبیأ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"مَنْ اَحَبَّنَا كَانَ مَعَنَا يومَ الْقِيَامَةِ، وَلَوْ اَنَّ رَجُلاً اَحَبَّ حَجَراً لَحَشَرَهُ اللهُ مَعَهُ يومَ القِيَامةِ" (15)

یعنی: "جو شخص ہم سے محبت کرے گا، وہ قیامت کے دن ہمارے ساتھ ہوگا؛ اور اگر ایک شخص کسی پتھر کا دلدادہ بن جائے تو قیامت کے دن اسی پتھر کے ہمراہ محشور ہوگا۔"

دراصل، کسی چیز کے ساتھ انسان کا حشر و نشر، انسان کے اندرونی ملکات کی بنیاد پر ہوگا۔ اگر ایک انسان انبیاء و اولیاء کے ساتھ محشور ہو تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے اندر اولیاء خدا کی صفات پائی جاتی ہیں جو اُس کی ماہیت کا جزو لاینفک بن چکی ہیں اور اگر ایک انسان پتھر کے ساتھ محشور ہو رہا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خود انسانیّت کے دائرے سے نکل کر پتھر بن چکا ہے۔ بقول ایک فارسی شاعر

گر بود اندیشہ ات گل، گلشنی　　ور بود خاری تو ھیمۂ گلخنی
من فاش کنم حقیقت مطلب را　　ھر چیز کہ در جستن آنی،

یعنی: ''اگر تیرے افکار پر پھول غالب ہوں تو تم گلشن ہو اور اگر تمہاری سوچوں میں کانٹے ہوں تو تم چولہے کا ایندھن ہو۔ میں اس مطلب کی حقیقت مزید آشکار کیے دیتا ہوں کہ تم جس چیز کی تلاش میں ہو، درحقیقت، تم خود وہی چیز ہو۔''

پس خودی میں خدائی ہے اور بے خودی میں روسیاہی ہے۔ اور روسیاہی سے بچنے کا واحد راستہ، خدائی، انقطاعِ الی اللہ اور فنا فی اللہ ہے۔ حکیم الامّت، علامہ محمد اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو روسیاہی!

کربلا، خودی کی سربلندی اور انسانی کرامت کی معراج

مذکورہ بالا بحث کی روشنی میں جب ہم واقعۂ کربلا پر دوبارہ نظر ڈالتے اور اس واقعہ پر ایک نئی جہت اور نئے زاویے سے نگاہ دوڑاتے ہیں تو کربلا، ہمیں انسانی خودی کی سربلندی اور کرامت کی معراج و مُعلّٰی نظر آتی ہے۔ یقینا کربلا کو "کربلا مُعلّٰی" کہنا بجا ہے؛ کیونکہ کربلا، انسانی کرامت اور خودی کی ثریا ہے۔ کربلا میں امام حسین علیہ السلام اور آپ کے انصار و اصحاب نے انسانی نفس کی بلندیوں کی وہ چوٹی سر کی جس کی بلندی تک عام انسانوں کے مرغِ تخیّل کے پاس طاقتِ پرواز نہیں ہے۔ آپ علیہ السلام اُس مقام پر پہنچے کہ آپ سے خطاب ہوا:

''یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً'' (16)

یعنی: ''اے مطمئن نفس! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آؤ! اس حالت میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی!''

آپ کے اسی مقام و منزلت کے پیشِ نظر حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

اقرؤا سورة الفجر فی فرائضکم و نوافلکم فانّها سورة الحسین بن علی علیهما السلام۔ من قرأها کان مع الحسین یوم القیامة فی درجته من الجنّة؛ ان الله عزو جل عزیز حکیم فقال له ابو اسامة: کیف صارت هٰذه السورة للحسین خاصة؟ فقال: ألا تسمع الی قوله تعالی: یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (17)

یعنی: "اپنی فریضہ اور نافلہ نمازوں میں سورۂ "الفجر" کی تلاوت کیا کرو! کہ یہ سورۃ الحسین ابن علی علیہما السلام ہے۔ جس نے اس سورہ کی تلاوت کی وہ قیامت کے دن جنّت میں حسین کے ساتھ آپ کے درجہ میں ہو گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ باعزّت اور صاحبِ حکمت ہے۔" ابو اسامہ نے آپ سے دریافت کیا کہ یہ سورہ کیسے امام حسینؑ کے ساتھ مخصوص ہو گئی؟ تو آپ نے فرمایا: "آیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا: ''اے مطمئن نفس! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آؤ! اس حالت میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی! پس میرے بندوں میں شامل اور میری جنّت میں داخل ہو جاؤ!''

حضرت امام حسین علیہ السلام کو یہ مقام اِس لئے عطا ہوا کہ آپ کے فکر و اندیشہ میں خدا کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ نے اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر دیا تھا۔ آپ کی زبان حال یہی تھی:

ترکت الخلق طُرّا فی هواك و أیتمت العیال لکی أراك

فلو قطعتنی فی الحبّ إربا لما مال الفؤاد إلی سواك (18)

یعنی: "میں نے پوری کائنات تیری چاہت میں ترک کر دی ہے اور تیرے دیدار کے شوق میں اپنے بچے یتیم کیے ہیں۔ اگر تو مجھے اپنی محبّت میں ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دے تو میرا دل تیرے غیر کی طرف مائل نہ ہو گا۔" البتہ آپ کی خداپرستی اور خدائی نے آپ علیہ السلام کی خودی کو سربلندی بخشی اور آپ کرامتِ نفس کی اُس منزل پر پہنچے کہ جہاں سر کٹوایا جا سکتا تھا؛ لیکن "گردن درِ باطل پہ جھکائی نہیں جاتی!" آپ کی خودی عشقِ الٰہی کی غیرت سے محکم تھی۔ آپ کے شریف اور باغیرت نفس کی ماہیّت کا تقاضا یہی تھا جو آپ فرما رہے تھے: '' هَيْهَاتَ مِنَّا الذِّلَّةُ'' (19) یعنی: ''ہم ہرگز ذلّت قبول نہیں کر سکتے۔'' آپ نے یہ بھی فرمایا: '' مَوْتٌ فِيْ عِزٍّ خَيْرٌ مِنْ حَيٰوةٍ فِيْ ذُلٍّ'' (20) یعنی: ''ذلّت کی زندگی سے عزّت کی موت بہتر ہے۔'' یوں آپ نے قیامت تک آنے والی ہر باشعور قوم کے لئے کرامتِ نفس کا یہ سنہری اصول چھوڑا:

چڑھ جائے کٹ کے سر تیرا نیزے کی نوک پر!
لیکن یزیدیوں کی بیعت نہ کر قبول!

کربلا کے محشر میں بھی آپ کے نفس میں بلا کا اطمینان تھا۔ کسی لختِ جگر کی شہادت، آپ کے پائے استقلال میں تزلزل ایجاد نہ کر سکی۔ دشتِ بلا و غم میں آپ کی ثابت قدمی، آپ کی خودی کی سربلندی کا پتہ دی رہی تھی۔ اس حوالے سے جوش ملیح آبادی نے کیا خوب کہا ہے:

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دم بدم　　دشت ثبات و عزم ہے دشت بلا و غم
صبر مسیح و جرأت سقراط کی قسم!　　اس راہ میں ہے ایک ہی انسان کا قدم
جس کی رگوں میں آتش بدر و حنین ہے　　جس سور ما کا نام گرامی حسین ہے!

حضرت امام حسین علیہ السلام کے نفس کی کرامت اور اطمینان کا یہ عالم تھا کہ آپ کا سر تن سے جدا کرنے کی غرض سے آنے والے شخص، ہلال بن نافع کا کہنا ہے:

فوالله ما رأيت قتيلا مخضبا بدمه أحسن منه و انور وجها، شغلني نور وجهه و جمال هيأته عن الفكرة في قتله (21)

یعنی: "اللہ کی قسم! میں نے ایسا کوئی مقتول نہیں دیکھا جو اپنے خون میں خضاب آلود ہو اور حسین (علیہ السلام) سے زیادہ خوبصورت اور نورانی ہو۔ اُن کے چہرے کے نور اور پیکر کے جمال نے مجھے ان کا سر تن سے جدا کرنے سے روک دیا۔"

میدان کربلا میں ہر قربانی پیش کرنے کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کے وقار اور عظمت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا اور آپ کے خشک ہونٹوں اور سوکھی زبان پر یہ مناجات تھی:

"صبرا على قضائك يا ربّ لا اله سواك يا غياث المستغيثين، ما لي ربّ سواك و لا معبود غيرك صبرا على حكمك يا غياث من لا غياث له۔۔۔" (22)

یعنی: "اے پروردگار! میں تیری قضا پر صابر ہوں؛ اے فریاد کرنے والوں کی فریاد سننے والے! تیرے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں ہے۔ تیرے سوا نہ کوئی میرا پالنے والا ہے، نہ میرا معبود ہے۔ اے ایسے لوگوں کے فریاد رس جن کا کوئی فریاد رس نہ ہو! میں نے تیرے حکم پر صبر اختیار کیا ہے۔۔۔"

یہ ایک حقیقت ہے کہ کربلا کے میدان میں نہ فقط حضرت امام حسین علیہ السلام، بلکہ آپ کے تمام انصار و اصحاب تعمیرِ خودی کی عظیم منزلوں اور نفس کی کرامت کی معراج پر فائز بھی تھے اور انہیں اپنے مقام کی

عظمت کا بھی بھرپور ادراک بھی تھا۔ وہ اس حوالے سے علم الیقین کی منزل پر فائز تھے کہ جس نے خدا کی رضا کے لئے اپنی خودی کو سربلند رکھا، وہ زندہ جاوید ہوا۔ کسی شاعر نے کربلا والوں کے فکر و فلسفہ اور اُن کی منطق کی یوں ترجمانی کی ہے:

دَورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد		ہے ابتداء ہماری، تیری انتہاء کے بعد

ہمیں اہلِ کربلا کی اس ذہنی رسائی اور باطنی کیفیّت کا بیان دربارِ یزید میں حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے ان الفاظ میں صاف صاف جھلکتا نظر آتا ہے:

أظننت یا یزید حیث اخذت علینا۔۔۔ ان بنا علی اللہ ھوانا و بك علی اللہ کرامۃ؟ ۔۔۔ فواللہ لا تمحوا ذکرنا و لا تمیت وحینا۔۔۔" (23)

یعنی: "اے یزید! ہم پر زمین و آسمان کا گھیرا تنگ کرنے کے بعد تیرا کیا گمان ہے کہ ہم اللہ کی بارگاہ میں رسوا ہوئے اور تجھے کرامت ملی؟ (نہیں! یہ تیری خام خیالی ہے؛ بلکہ ہم زندۂ جاوید ہیں) اور اللہ کی قسم! تو ہمارا ذکر مٹا نہیں سکتا اور ہماری وحی کو موت کی سان چڑھا نہیں سکتا!"

کیوں؟ اس لئے کہ جس کے اندر حقیقی خودی بیدار اور جس کا نفس عشقِ پروردگار سے سرمست ہو، وہ کبھی مرتا نہیں؛ بلکہ جریدۂ عالم پر اُس کا دوام ثبت ہو جاتا ہے۔ یہ وہی حقیقت ہے جس کی ترجمانی حکیم الامّت، علامہ محمد اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں کی ہے:

خودی میں ڈوب جا غافل، یہ سرّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا!

حوالہ جات

1۔ ابراہیم/ ۲۴-۲۵
2۔ الاسراء/ ۷۰۔
3۔ الشّمس/ ۷۔

4۔ فصّلت/۵۳۔

5۔ الذاریات/۲۰،۲۱۔

6۔ المنسوب للامام الصادق، مصباح الشریعہ، الطبعۃ الاولیٰ، مؤسسۃ الاعلمی، ۱۴۰۰ھ۔ق، ص13، بیروت۔

7۔ آمدی، الواحد، غرر الحکم و درر الکلم (کلمات قصار امیر المؤمنین)، مؤسسۃ انتشاراتی امام عصر، حدیث 151 قم۔

8۔ علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال، ص 301۔

9۔ نہج البلاغہ، حکمت 441۔

10۔ اس موضوع پر مزید مطالعہ کے لئے دیکھیے:

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین، اسلام اور اخلاقی اقدار، ہادی فاؤنڈیشن، مارچ/2010، ص 145 تا 179۔

11۔ الحشر/۱۹

12۔ نہج البلاغہ، فیض مکتوب/۳۱۔

13۔ المجلسی، بحار الانوار، مؤسسۃ الوفا، الطبع الثانیۃ، ۱۴۰۳ھ، ج 75، ص 35، باب 21، بیروت۔

14۔ الحرانی، ابن شعبہ، تحف العقول عن آل الرسول، مؤسسۃ النشر الاسلامی لجماعۃ المدرّسین، ۱۴۰۴ھ، ق، الطبعۃ الثانیۃ، ص 483، قم، ایران۔

15۔ ابن طاوؤس، السید رضی الدین علی بن موسی جعفر، اقبال الاعمال، المطبعۃ مکتب الاعلام الاسلامی، الطبعۃ الاولی، ۱۴۱۴ھ، ق، ج ۳، ص ۳۰۔

16۔ الفجر/۲۷، ۲۸۔

17 ۔ الصفّار، محمد بن الحسن، بصائر الدرجات، منشورات الاعلمی، ۱۴۰۴ھ، ق، ص/۱۶۲، طہران۔

18۔ البحرانی، عبد العظیم، من اخلاق الامام الحسین (ع)، انتشارات شریف الرضی، ۲۰۰۰ میلادی، ص ۲۵۸، قم، ایران۔

19 ۔ الشیخ الطبرسی، الاحتجاج، دار النعمان للطباعۃ والنشر، ج ۲، ص ۲۴، النجف الاشرف

20 ۔ المجلسی، بحار الانوار، مؤسسۃ الوفا، الطبع الثانیۃ، ۱۴۰۳ھ، ج ۴۴، ص ۱۹۲، بیروت۔

21 ۔ الامین، السید محسن، اعیان الشیعۃ، دار التعارف للمطبوعات، ج ۱، ص ۶۱۰، بیروت۔

22 ۔ لجنۃ الحدیث فی معہد باقر العلوم (ع)، موسوعۃ کلمات الامام الحسین (ع)، دار المعروف للطباعۃ والنشر، ۱۹۹۵، ص ۶۱۵۔ قم، ایران۔

23 ۔ الحلی، ابن نما، مثیر الاحزان، المطبعۃ الحیدریۃ، ۱۹۵۰ (بمطابق ۱۳۶۹)، ص ۸۱، النجف الاشرف۔

کتاب شناسی

عیون اخبار الرضا(ع)

سید رمیز الحسن موسوی*
srhm2000@yahoo.com

شیعہ کتب حدیث میں ایک اہم کتاب ''عیون اخبار الرضا(ع)'' ہے کہ جس کے مؤلف چوتھی صدی ہجری کے ممتاز شیعہ عالم دین شیخ صدوق علیہ الرحمہ ہیں۔ عربی زبان میں لکھی جانے والی یہ کتاب آٹھویں امام حضرت علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کے حالات اور احادیث کا ایک اہم مجموعہ ہے۔ شیخ صدوقؒ کی دوسری کتب کے علاوہ یہ کتاب بھی حدیث اور سیرت کے اہم ترین منابع میں شمار ہوتی ہے۔

مؤلف کتاب

اس کتاب کے مؤلف شیخ صدوق علیہ الرحمہ ہیں کہ جن کا تذکرہ کتب حدیث کے تعارف کے سلسلے ''شیعہ محدثین اور ان کی کتب حدیث'' کے ضمن میں ہو چکا ہے۔(*) لیکن یہاں انتہائی اختصار کے ساتھ شیخ صدوقؒ کے حالات کو دوبارہ تحریر کیا جاتا ہے تاکہ مذکورہ کتاب کا تعارف بہتر انداز میں کرایا جاسکے۔ محمد بن علی بن حسین بن بابویہ قمی المعروف ''شیخ صدوق'' ۳۰۵ھ میں قم کے ایک علمی ومذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بعض روایات کے مطابق شیخ صدوق کی تاریخ پیدائش ۳۰۶ھ اور ۳۰۷ھ ذکر ہوئی ہے۔ شیخ صدوقؒ کی ولادت کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی دعا سے متولد ہوئے ہیں۔ شیخ صدوقؒ کا گھرانہ قم کا ایک مذہبی اور علمی گھرانہ سمجھا جاتا تھا، اُن کے والد علی بن حسین بن بابویہ قمی اپنے وقت کے مشہور فقہاء اور علما میں سے تھے۔

---

*۔مدیر مجلّہ سہ ماہی "نور معرفت" نور الہدیٰ مرکز تحقیقات (نمت) بھارہ کہو، اسلام آباد
**۔''نور معرفت''، شمارۂ مسلسل (٦)

اُس زمانے میں اگرچہ بہت سے علما اور محدثین قم میں موجود تھے، لیکن زہد و تقویٰ اور علم و عبادت کی وجہ سے دینی مرجعیت کی ذمہ داری علی بن بابویہ کے کاندھوں پر ڈالی گئی تھی۔ اُن کی قم کے بازار میں ایک چھوٹی سی دکان تھی جس سے وہ اپنا گذر بسر کرتے اور رزق حلال کماتے تھے اور دن کے اوقات میں کچھ گھنٹے اپنے ہی گھر میں علم وفقاہت کی تدریس بھی کرتے اور احکام دین اور احادیث اہل بیت اطہارؑ کی تبلیغ فرماتے تھے۔

شیخ صدوق دنیائے اسلام کی ایک نمایاں علمی شخصیت ہیں جو اسلامی علوم کے مختلف شعبوں میں علم و فضل کے عنوان سے پہچانے جاتے ہیں اور بے شمار علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ چونکہ اُنہوں نے ائمہ اطہار علیہم السلام کا قریبی زمانہ دیکھا ہے اور اہل بیت اطہارؑ کی احادیث و روایات کو جمع کرکے بہت سی نفیس کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جس کی وجہ سے اُن کی کتب حدیث کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ شیخ صدوق نے تقریبا بیس سال سے زیادہ عرصہ تک اپنے والد بزرگوار شیخ علی بن بابویہ کے حضور زانوئے تلمذ تہ کیے ہیں اور اس دوران اپنے والد کے علاوہ قم میں موجود بہت سی دوسری علمی شخصیات سے بھی کسب فیض کیا ہے۔ جب اُن کے والد گرامی نے اس دار فانی کو الوداع کہا تو اُن کی عمر اس وقت ۲۲ یا ۲۳ سال تھی۔ والد کے بعد اہل بیت اطہار علیہم السلام کے علوم اور احادیث کی نشرواشاعت کی ذمہ داری شیخ صدوقؒ کے دوش پر آپڑی جسے اُنہوں نے اپنی بے پناہ استعداد اور علمی و معنوی صلاحیت کی وجہ سے بطور احسن پورا کیا۔ (1)

شیخ صدوق کے بعد آنے والے تمام علمائے حدیث و رجال نے اُن کے علمی مقام و منزلت کا اعتراف کیا ہے اور اُن کے علم حدیث میں مقام وخدمات کی تعریف کی ہے:

شیخ طوسی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۴۶۰ھ) اُن کی علمی و معنوی شخصیت کے بارے میں لکھتے ہیں: ''وہ ایک جلیل القدر عالم دین اور احادیث کے حافظ تھے۔ احوال و رجال سے مکمل طور پر آگاہ تھے سلسلہ احادیث میں ایک ماہر نقاد شمار ہوتے تھے، قم کے بزرگان میں احادیث کے حفظ اور معلومات کی کثرت کے اعتبار سے اُن جیسا کوئی نہیں تھا۔ اُنہوں نے تقریبا تین سو کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔'' (2)

علم رجال کے ماہر نجاشی (متوفی ۴۵۰ھ) اُن کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ری میں ساکن ابو جعفر (شیخ صدوق) خراسان میں شیعوں کی نمایاں شخصیت ہیں؛ وہ بغداد بھی گئے ہیں اگرچہ وہ جوانی کی عمر میں تھے اس کے باوجود سبھی شیعہ بزرگ اُن سے استماع حدیث کرتے تھے، اُن کی بہت زیادہ کتابیں ہیں۔'' (3)

تالیفات

مختلف اسلامی علوم وفنون میں شیخ صدوقؒ کی تالیفات اُن کے علم وفضل کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ خصوصاً علم حدیث میں شیخ صدوق کا نام شیعہ محدثین میں سر فہرست سمجھا جاتا ہے۔ شیخ صدوق کی تالیفات کو ایک ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے لیکن اب بھی اُن میں ویسی ہی علمی تازگی ملتی ہے جیسی خود شیخ کے زمانے میں تھی۔ حتیٰ ہر زمانے میں شیخ کی کتابوں کے بغیر کوئی شخص نہ تو فقہ میں درجہ اجتہاد پر پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی دوسرے علوم وفنون میں علم کے درجات طے کر سکتا ہے۔ شیخ صدوق کی کتابوں کی مختصر فہرست یہ ہے:

۱۔ من لایحضرہ الفقیہ (4)	۲۔مدینۃ العلم	۳۔ کمال الدین وتمام النعمہ
۴۔التوحید	۵۔الخصال	۶۔ معانی الاخبار
۷۔ عیون اخبار الرضا علیہ السلام	۸۔الامالی	۹۔المقنع فی الفقہ

عیون اخبار الرضا (علیہ السلام)

ابو جعفر شیخ صدوقؒ (۳۰۵۔۳۸۱ھ) کی یہ کتاب عربی زبان میں ہے جو امام رضا علیہ السلام کی احادیث اور حالات کے بارے میں ہے۔ کتاب ''عیون اخبار الرضا'' کا شمار شیعوں کی معتبر کتب حدیث میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب بھی شیخ صدوقؒ کی دوسری کتابوں کی طرح انتہائی قدر و منزلت رکھتی ہے۔اس کتاب میں بہت سے شیعہ عقائد کی وضاحت کی گئی ہے اور اس لحاظ سے اس کتاب کو بہت قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ شیخ صدوقؒ نے اس کتاب میں امام رضا علیہ السلام کے فرامین اور اس زمانے کے دوسرے علما کے ساتھ کئے گئے علمی مناظرات کو نقل کرکے بہت ہی اہم اسلامی عقائد کو پیش کیا ہے۔اسی طرح اس کتاب میں بہت سے فقہی موضوعات کے بارے میں بھی احادیث نقل ہوئی ہیں۔ اس کتاب میں پیش کئے گئے علمی مطالب کو دیکھ کر ممتاز عالم اور فلسفی میر داماد ؒ نے جو شعر کہے ہیں، اُن سے اس کتاب کی علمی ودینی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے:

عیون أخبار الرضا صیقل تجلو　　عن القلب صداء الکرب

لم یبد للدھر نظیرالھا　　لناظر فی الشرق و الغرب

و کل فن فی أسالیبھا　　یکفیك و تخلیة السرب

کالشمس من نور الھدی مشرق　　بالسلم یقضی وطر القلب (5)

ان اشعار کا مفہوم کچھ یوں ہے:

''عیون اخبار الرضا'' ایک ایسی شفاف کتاب ہے جو قلب انسان کو شفا بخشتی ہے۔ شرق و غرب میں کسی بھی زمانے میں کسی بھی دیکھنے والے نے اس جیسی کتاب نہیں دیکھی۔ اس کتاب میں ہر وہ علم ہے جو تم چاہتے ہو اور یہ تمہیں بے نیاز کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ کتاب حیرت انگیز طور پر خورشید کی طرح نور ہدایت پھیلاتی ہے اور دل کی آرزوئیں بھر لاتی ہے۔

عیون اخبار الرضاؑ کی وجہِ تالیف

شیخ صدوقؒ نے یہ کتاب اپنے زمانے کے ایک شیعہ حاکم اور وزیر صاحب بن عباد دیلمی کے کتابخانے کو ہدیہ کرنے کے لئے لکھی تھی۔ صاحب بن عباد امام رضا علیہ السلام کی مدح میں کچھ اشعار کہتا ہے اور یہ اشعار شیخ صدوقؒ کو ہدیہ میں پیش کرتا ہے لہٰذا شیخ صدوقؒ بھی اس کے جواب میں یہ کتاب تالیف کر کے اُسے ہدیہ کرتے ہیں۔ شیخ صدوقؒ اس کتاب کے مقدمے میں کتاب تالیف کرنے کا مقصد اور سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امابعد قال ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین بن موسیٰ بن بابویه القمی الفقیه مصنف هذا الکتاب رحمة الله علیه: وقع قصیدتان من قصائد الصاحب الجلیل کافی الکفاة ابی القاسم اسماعیل بن عباد۔۔۔۔۔۔۔ الخ'' (6)

یعنی: حمد و ثنا کے بعد اس کتاب کا مصنف ابو جعفر علی بن الحسین بن موسی بن بابویہ القمیؒ عرض پرداز ہے کہ صاحب الجلیل کافی الکفاۃ ابی القاسم اسماعیل بن عباد اطال اللہ بقائہ و ادام دولتہ و نعمائہ و سلطانہ کے دو قصیدے میرے سامنے پیش کیے گئے، جن میں امام ہشتم ضامن غریباں حضرت امام علی رضاؑ کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ تو میں نے ان قصائد سے متاثر ہو کر یہ کتاب تالیف کی ہے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ محترم صاحب بن عباد کے خزانۂ معمورہ کے لیے

اس سے بہتر تحفہ ممکن نہیں ہے اور خود محترم صاحب بن عباد علوم اہل بیتؑ کے شیدائی ہیں اور ان کی ولایت سے تمسک رکھتے ہیں اور ان کی اطاعت کو فرض جانتے ہیں اور ان کی امامت پر یقین رکھتے ہیں اور ان کی ذریت کا احترام کرتے ہیں۔ خدا کرے کہ ان کے احسانات کا سلسلہ شیعان اہل بیتؑ تک ہمیشہ جاری و ساری رہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کے ذریعہ سے میں ان کے احسانات کا بدلہ چکا سکوں گا اور ان کی خدمت گزاری میں مجھ سے جو کمی واقع ہوئی ہے، اس کتاب کے ذریعہ اس کی تلافی کرسکوں گا۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ انہیں عدل و انصاف کی توفیق مرحمت فرمائے اور اس کے ذریعہ سے خدا کا کلمہ بلند و بالا ہو، اللہ تعالیٰ انہیں نیکی و بھلائی کی توفیق عطا فرمائے۔

صاحب بن عباد کے قصیدے کے چند شعر

جناب صاحب الجلیل اسماعیل بن عبادؒ نے امام رضا علیہ السلام کے حضور ہدیہ پیش کرتے ہوئے عرض کیا ہے:

یا سائرا زائرا إلی طوس　　　مشهد طهر و أرض تقدیس

سرزمین طوس کی طرف سفر کرنے والا زائر، وہ سرزمین جو کہ ایک طاہر کا مقام شہادت ہے اور جو پاکیزہ ترین سرزمین ہے۔

أبلغ سلامی الرضا و حط　　　علی أکرم رمس لخیر مرموس

وہاں پہنچ کر رضاؑ کو میرا سلام پہنچانا، وہاں اس مکرم قبر پر جانا جہاں مکرم ترین فرد مدفون ہے۔

و اللہ و اللہ حلفة صدرت　　　من مخلص فی الولاء مغموس

بخدا ولائے آل محمدؐ میں یہ شخص قسم کھا کر کہتا ہے

إنی لو کنت مالکا إربی　　　کان بطوس الفناء تعریس

اگر میں خود مختار ہوتا تو اپنے گھر بار کو چھوڑ کر طوس کی جانب تیزی سے چلا جاتا

و کنت أمضی العزیم مرتحلا　　　منتسفا فیه قوة العیس

تو میں تیز رفتار اونٹوں کی سی قوت سے جانب طوس روانہ ہو جاتا"

لمشهد بالذكاء ملتحف　　و بالسناء و الثناء مأنوس

میں اس شہر شہادت کی جانب سفر کرتا جس میں عقل مخلوط ہوچکی ہے اور تیز روشنی اور تعریف سے مانوس ہے۔

یا سیدی و ابن سادتی ضحکت　　وجوہ دھری بعقب تعبیس

اے میرے سردار اور سرداروں کے فرزند! آپ کی وجہ سے ترش روئی کے بعد میرے زمانہ کے چہرے مسکرا اٹھے۔

لما رأیت النواصب انتکست　　رایاتھا فی زمان تنکیس

(اس مسکراہٹ کی وجہ یہ ہے کہ) میں نے نواصب کے پرچموں کو سرنگوں ہوتے ہوئے پایا ہے۔(7)

کتاب کی اہمیت

ہماری کتب حدیث میں ''عیون اخبار الرضا'' کوایک خاص مقام حاصل ہے اور یہ کتاب اپنے بعد لکھی جانے والی بہت سی دوسری کتب حدیث کے منابع میں سے شمار ہوتی ہے۔ مثلاً ''بحار الانوار''میں علامہ مجلسیؒ نے اس کتاب سے کافی روایات نقل کی ہیں۔اس کتاب کی اہمیت اور مقام کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے چند ایک کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے۔

عیون اخبار الرضا کے مضامین اور عناوین:

''عیون اخبار الرضا''ایک مقدمے اور ۶۹ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بہت سے شیعہ عقائد کی شرح اور وضاحت کے لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ شیخ صدوقؒ نے مختلف فرقوں اور مذاہب کے علماء اور دانشوروں کے ساتھ امام رضاعلیہ السلام کے کلامی مناظرات وابحاث کو نقل کرکے آئندہ نسلوں کے لئے بہت بڑا کلامی ذخیرہ فراہم کیا ہے۔

اس کتاب کا ایک اہم ترین موضوع ''عصمت انبیاء'' ہے۔ اس موضوع پر جتنی بھی احادیث اس کتاب میں نقل ہوئی ہیں وہ عصمت انبیاء کے عنوان سے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں کیونکہ اگر اس کتاب میں یہ روایات واحادیث نقل نہ ہوتیں تو عصمت کے باب میں ائمہ طاہرین علیہم السلام کے بہت سے معارف پوشیدہ رہ جاتے اور علم کلام میں ہمارے پاس ''عصمت'' کا باب تشنہ رہ جاتا۔امام رضاعلیہ السلام نے مامون

اور دوسرے علماء کی طرف سے "عصمت انبیاء" کے متعلق اُٹھائے گئے سوالات اور شبہات کا شافی جواب دے کر ایک اہم کلامی مسئلے کی وضاحت فرمائی ہے۔

اس کتاب میں کلامی واعتقادی مسائل کے ساتھ ساتھ بہت سے تاریخی مسائل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب تاریخ کے باب میں ائمہ اطہار علیہم السلام اور مذہب شیعہ کے واضح نظریات اور موقف کو پیش کرتی ہے۔ اس کتاب کے ابواب میں ذکر ہونے والے معارف کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

۱۔ امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کی سیرت اور تاریخ سے متعلق روایات۔ (باب ۱تا۵)

۲۔ امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کے مامون الرشید کی خلافت کے دوران دوسرے مسالک اور فرقوں کے علماء اور دانشوروں سے مناظرات۔ (مثلاً باب باب نمبر ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۴)

۳۔ امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کی زبان مبارک سے منقول اپنے آباء واجداد کی احادیث اور روایات۔ (باب نمبر ۱۶تا۳۰)

۴۔ امام رضا علیہ السلام کے آباء واجداد کے اپنے اپنے زمانے کے علماء سے مناظرات۔

اس کتاب کے چند باب بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ مثلاً:

الف: وہ ابواب جن میں ائمہ اثنا عشر کے بارے میں ائمہ اطہارؑ کی جانب سے نصوص کا تذکرہ ملتا ہے۔

ب: وہ باب جس میں امام رضا علیہ السلام نے توحید کے بارے میں اہم معارف بیان فرمائے ہیں۔ اس باب میں شیعوں کے بعض مخالفین کے گمراہ کن پروپیگنڈے کا جواب دیا گیا ہے کہ جو شیعوں پر حلول، تجسیم اور دوسرے کفر پر مبنی عقائد کی تہمتیں لگاتے ہیں۔

ج: مختلف اسلامی وغیر اسلامی فرقوں اور مذاہب کے علماء کے ساتھ امام رضا علیہ السلام کے مناظرات پر مبنی ابواب۔

د: امام اور امامت کی علامتوں اور خصوصیات کے متعلق ابواب کہ جن میں امامت کی بنیادی خصوصیات ذکر کی گئی ہیں۔ اسی طرح امامت اور تشیع کی حقیقت مبنی باب بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس میں غالیوں اور مفوضہ کا ردّ اور ابطال پیش کیا گیا ہے۔

ع: وہ باب جس میں ایمان کی حقیقت و معنیٰ بیان کیا گیا ہے۔

غ: وہ باب جس میں امام رضا علیہ السلام کے معجزات اور کرامات کا ذکر ملتا ہے جن میں امام کی پیشگوئیاں اور بعض افراد کے اسرار بیان ہوئے ہیں۔اسی طرح ایک باب میں امام علیہ السلام کی زیارت سے متعلق اہم روایات ذکر ہوئی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اس کتاب کی بہت زیادہ خصوصیات ہیں جس کی وجہ سے یہ کتاب اپنے زمانہ تالیف سے لے کر آج تک علماء اور دانشوروں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

"عیون اخبار الرضا" کے مختلف زبانوں میں ترجمے

کتاب عیون اخبار الرضا کے فارسی میں بہت سے ترجمے کئے گئے ہیں اسی طرح ایک اُردو ترجمہ بھی موجود ہے۔ یہاں چند فارسی اور ایک اُردو ترجمے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

فارسی ترجمے:

۱۔ترجمہ محمد صالح بن محمد باقر قزوینی۔

۲۔ترجمہ سید جلیل میرزا ذبیح اللہ بن میرزا ہدایۃ اللہ۔

۳۔ترجمہ مولیٰ علی بن طیفور بسطامی۔

۴۔ترجمہ سید علی بن محمد بن اسد اللہ امامی۔

۵۔ترجمہ شیخ محمد تقی بن محمد باقر اصفہانی المعروف آقا نجفی اصفہانی۔

۶۔ترجمہ عیون اخبار الرضا بنام کشف النقاب۔

۷۔ترجمہ بنام "برکات المشہد المقدس"۔

۸۔عیون کا ایک فارسی ترجمہ ۱۲۴۵ ہجری میں مشہد مقدس کے ایک فاضل عالم دین نے کیا ہے۔یہ ترجمہ سید محمد بن سید دلدار علی نقوی نصیرآبادی کے حکم پر کیا گیا تھا۔

۹۔ترجمہ علامہ مجلسی، یہ ترجمہ کتاب کے بعض حصوں پر مشتمل ہے، جس میں خطبہ توحید امام رضا علیہ السلام اور چند دوسرے موضوعات شامل کئے گئے ہیں۔

اُردو ترجمہ

''عیون اخبار الرضا'' کا اُردو ترجمہ ۱۴۲۱ھ میں جناب محمد حسن جعفری صاحب نے کیا ہے جو اکبر حسین جیونی ٹرسٹ کراچی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔

''عیون اخبار الرضا'' کی شرحیں

اس کتاب کی اہمیت اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ دوسری کتب حدیث کی مانند اس کتاب پر بھی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہے۔

۱۔ شرح علی اصغر بن سید حسین حکیم بن سید علی شوشتری

۲۔ شرح محمد علی حزین بن شیخ ابو طالب زاہدی گیلانی

۳۔ شرح سید نعمت اللہ جزائری

۴۔ شرح مولیٰ ہادی بنابی

۵۔ شرح خطبۃ الرضا نوشتہ حسن بن علی گوہر قراچہ داغی

کتاب عیون اخبار الرضا علیہ السلام کی مختلف ایڈیشن

اس کتاب کے مختلف ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں سے بعض فارسی ترجمے اور عربی متن کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض کو ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ قم میں ''انتشارات پیام علمدار'' کی طرف سے ۱۴۲۸ ھجری میں '' عیون اخبار الرضا'' کا پہلا ایڈیشن آقا نجفی اصفہانی کے ترجمے کے ساتھ ۲ جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

۲۔ تہران کے ادارے انتشارات جہان نے ۱۳۷۸ شمسی میں '' عیون اخبار الرضا'' ۲ جلدوں میں شائع کی ہے۔

۳۔ بیروت کے مشہور اشاعتی ادارے ''مؤسسہ اعلمی کی طرف سے ۱۴۰۴ھجری میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۲ جلدوں میں شائع ہوا ہے۔

۴۔ قم کے مشہور پبلشر ''انتشارات شریف رضی'' کی طرف سے بھی ۱۳۷۸ شمسی میں یہ کتاب ۲ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ یہ اشاعت بھی مفید تحقیقی حواشی کے ساتھ چھپی ہے۔

۵۔ یہ کتاب اُردو زبان میں کراچی کے ادارے اکبر حسین جیوانی ٹرسٹ کی جانب سے جناب محمد حسن جعفری صاحب کے ترجمے کے ساتھ ۲ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

*****

حوالہ جات

1۔ دائرۃ المعارف تشیع، ج۱، ص۳۰۵

2۔ شیخ طوسی، الفہرست، ص۲۳۷

3۔ نجاشی، رجال نجاشی، ص۳۸۹

4۔ اس کتاب کا تفصیلی تعارف نور معرفت کے شمارے میں گذر چکا ہے۔

5۔ استفادہ از ویب سائٹ تبیان

6۔ شیخ صدوق: مقدمہ، عیون اخبار الرضا، ج۱، ص۱۱، قم، انتشارات الشریف الرضی، ۱۳۷۸ش

7۔ مقدمہ عیون اخبار الرضا (اُردو ترجمہ)، ص۴۴، کراچی، اکبر حسین جیوانی ٹرسٹ

THE CONCEPT AND NECESSITY OF ISLAMIC STATE

By: ***Dr. Sajjad Ali*** [*]
sajjad04ali@yahoo.com

Key Words: *Islamic state, Islam, Monarchy, Democracy, Divine government.*

Abstract:

Since decades there has been debate and research amongst our scholars and clergy regarding the Islamic government, its necessity and characteristics. It is not the actual concept of Islamic state that where there are Muslims in majority there is an Islamic state. The actual concept of Islamic state refers to a state where laws of state are made in accordance with Islamic principles i.e. Quran and Sunnah rest in the center of state laws. Therefore, if the state is based on socialism, liberalism etc., the state could not be called an Islamic state.

Moreover, a state can be termed as an Islamic state when both the government and state are ruled by religion as government is an element of state. In this context, an Islamic government can vividly be distinguished from a democratic or monarchic one. The nature of an Islamic government is neither monarchic, nor western democracy. It is a divine government. In this article, the concept of Islamic government and its differences with other political systems has been exposed.

[*]. Dr. Sajjad Ali, Teaching Associate, Department of Islamic Sciences, Karachi University.

A STUDY OF ALLAMA IQBAL'S EFFORTS FOR REVIVAL OF JURISPRUDENCE

By: ***Gul Wahid****
nadeemgulwahid@gmail.com

Key Words*: Jurisprudence, Islamic law, Revival of Islam, Movement and progress*

Abstract:

In Islamic law Ijtihad (jurisprudence) is to solve a legal issue by maintaining an independent view about it. Ijtihad has a great significance in Islamic legal system. Islamic scholars have, therefor, mentioned some conditions about it. Ijtihad means to express own views regarding a legal issue not to alter the Islamic law. The authority to maintain an independent view is given only to Islamic jurists. The great thinker, Allama Iqbal, has written about this subject. He has stressed on the need of ijtihad in solving modern problems and revival of Islam not only for Muslims of subcontinent but, for the whole Muslim community. For him, the Islamic community has been statical since five century due to the negligence of the principle of movement and progress. The Islamic community needs jurisprudential mind so that life and ideas remain fresh and rejuvenated. In this article the views of Iqbal regarding ijtihad has been analyzed in the light of the views of different thinkers about the topic.

*. Research Scholar; Department of Islamic Sciences, K.U.

IMPORTANCE OF EDUCATION AND NURTURATION IN THE LIGHT OF IMAM KHOMEINI'S THOUGHTS

By: ***Syed Rameez-ul-Hassan Mosavi****
srhm2000@yahoo.com

Key Words: *Education and Nurturation, Purification of soul, The Holy Prophets, Human soul*

Abstract:

Education and Nurturation refers to the tools that are indispensable in grooming of a person and polishing his potentialities. In this article the importance of the subject has been discussed. Islam has given a special status to Education and Nurturation. Quran has attached it with prophethood. All the prophets are educators and teachers of humanity.

After Prophets, Ulamas have to perform this role. And Imam Khomeini is the person who, in the light of the principles Islamic education and nurturation, struggled to equip those who had been oppressed with cruelty and ignorance. Today, our Pakistani society is facing countless problems in the field of education and nurturation due to the westernized rulers. For such a society, the study of imam Khomeini's thought would be beneficial; the thoughts that have brought a revolution in the fields of education and nurturation in our neighboring country Iran. In Iran, a brave and enlightened generation is grooming under this system.

*. Editor Quarterly Noor-e-Marfat; NMT; Bara Khau, Islamabad.

COMMUNICATION APPROACHES IN CONTEMPORARY ISLAMIC STATES

*By :**Dr. Muhammad Riaz*[*]
riaz.razee@yahoo.com

***Key Words**: West, Islamic government, Modern means of communication, Muslim thinkers*

Abstract:

The established means of communication in contemporary Islamic states are those that have been hired from the west and they are used in a way that other nations do. In the context of Islamic states, the means of communication can be divided into two categories. The first category is consisted of traditional means of communication that include daily prayers, the prayers of Friday and two Eids, Islamic seminaries and schools, and mosques etc. The other category is that of modern means of communication that could be further divided into visual, hearable, communicatory, and verbal. Some Islamic thinkers are too tough about the usage of modern means of communication, but generally they are used in Islamic states. This article is about the usage of modern means of communication in Islamic states and the views of Muslim thinkers about them.

*. Research Scholars at K.U. Karachi.

AN ANALYTICAL STUDY OF RELATIONS BETEEN MUSLIMS AND JEWISH IN THE EARLY DAYS OF ISLAM

By: ***Dr. Muhammad Afzal****
dr.muhammadafzalkarimi@gmail.com

Key Words*: Migration of Medina, The accord of Medina, Jewish tribes, Jewish breakage of the accord*

Abstract:

After the migration the holy prophet (PBUH) gave a new direction to the relationship with different tribe to stabilize the newly-born state. After the Accord of Medina he struck separate agreements with influential Jewish tribes as their influence was visible in many ways. If the holy Prophet's relations with those Jewish tribes were bitter, Muslim would face difficulties. Instead of all these development, soon the Muslim-Jews relations started to be sour. During this period there occurred some events that have created skepticism in the minds of some researchers that must be responded satisfactorily. In must be kept in view that what is the significance of this topic today? The answer to this question is that the two basic sources of Islam, Quran and the tradition of Holy Prophet (PBUH), must be observed to have a correct picture of Muslim-Jews relations.

*. Research Scholar; Karachi University.

THE IMPORTANCE AND PHILOSOPHY OF HAJJ: A STUDY IN THE LIGHT OF NAHJ-UL-BALAGHA

By: ***Roshan Ali****
roshanali007@yahoo.com

Key Words: *Hajj (Pilgrimage), Capability, Mandatory, Philosophy, Ka'ba, Muslim community, Congregation.*

Abstract:

Hajj is the most important, lengthy, and multi-dimensional congregation of Islam that could be called Islamic public congregation. Hajj is mandatory once in life on a person who has capacity to perform it. During Hajj, Hojjaj are obliged to perform specific ritual in specific days. It is obligatory on everyone to wear one kind of dress and utter same words. This is a unique ritual in which one place and one time have been specified. Everyone is obliged to perform it on the specific days of the month of Zilhajjah and the specific place; a place where a building was constructed for the first time to warship Allah. In this article the sacredness and history of Ka'ba as well as the philosophy of Hajj, its importance and rules have been discussed in the light of Nahj-ul-Balagha.

*. Assistant Professor, Model College For Boys, Islamabad.

KARBALA: THE TOPMOST OF HUMAN EGO AND THE ULTIMATE OF HIS DIGNITY

By: ***Dr. Sheikh Muhammad Hussanian****
sheikh.hasnain26060@gmail.com

Key words: *Karbala, Ego, Dignity, Divine Love, Imam Hussain (AS)*

Abstract

Karbala is like a blessing-tree that gives the fruits of guidance to men of every age according to their conditions and needs. Yes, it is important to explore the evient of 'Karbala' from those perspectives that can bring about new aspects and dimensions of Karbala. In this article, an attempt has been made to look at Karbala from the perspective of dignity and the topmost of human Ego.

According to the article, God has gifted the Human beingss with the dignity and Ego that hasn't been given to any other creature. Human Ego is an outcome of divinity and real human Ego is painted with divinity (صبغة الله). But, if someone does not take care of the significance of his Ego and sell it in return for the low-priced world, it results in the loss of his dignity and fall from humanity to the degrees of animals.

In this contrast, if we explore the incident of Karbala, we find that Imam Hussain (AS) and his companions reached the topmost of human Ego and dignity; that no one can even imagine to reach. They possessed strong Ego and never accepted humiliation. They preferred an honorable death over a disgraceful life. That is why, they became alive forever after drowning themselves in the ultimate sea of divine Ego.

*. Research Scholar; Director NMT

سہ ماہی **نور معرفت**

ممبر شپ فارم

نام: _____ تعلیم: _____

پیشہ: _____ فون نمبر: _____

پتہ: _____

_____

E-mail: _____

براہ کرم سال _____ کے لئے نور معرفت میرے نام جاری کر دیجئے۔ شکریہ دستخط خریدار: _____

دفتری استعمال کے لئے

برادر/خواہر _____ کی ممبر شپ برائے سال _____ کی درخواست منظور کرتے ہوئے رجسٹریشن نمبر جاری کر دیا گیا ہے متعلقہ ممبر کو مجلّہ باقاعدگی سے ارسال کیا جائے گا۔

رجسٹریشن نمبر: _____ تاریخ اجراء: _____ ممبر ساز: _____

نوٹ: مجلّہ کا 2015ء کے لئے زرِ سالانہ مبلغ:/500 روپے اور فی شمارہ:/130 روپے ہے۔

خط وکتابت کا پتہ:

سہ ماہی نور معرفت/نوری الہدیٰ مرکز تحقیقات/نور الہدیٰ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

سادات کالونی/بارہ کہو اسلام آباد/فون: 051-2231937

www.nht.org.pk, www.nmt.org.pk

E-mail:noor.marfat@gmail.com

زمین پر حجت خدا کا وجود اور امامؑ وقت کے لئے دعا

اللّٰهُمَّ إِنَّكَ أَيَّدْتَ دِينَكَ فِي كُلِّ أَوَانٍ بِإِمَامٍ أَقَمْتَهُ عَلَماً لِعِبَادِكَ، وَ مَنَاراً فِي بِلَادِكَ بَعْدَ أَنْ وَصَلْتَ حَبْلَهُ بِحَبْلِكَ، وَ جَعَلْتَهُ الذَّرِيعَةَ إِلَى رِضْوَانِكَ، وَ افْتَرَضْتَ طَاعَتَهُ، وَ حَذَّرْتَ مَعْصِيَتَهُ، وَ أَمَرْتَ بِامْتِثَالِ أَوَامِرِهِ، وَ الِانْتِهَاءِ عِنْدَ نَهْيِهِ، وَ أَلَّا يَتَقَدَّمَهُ مُتَقَدِّمٌ، وَ لَا يَتَأَخَّرَ عَنْهُ مُتَأَخِّرٌ فَهُوَ عِصْمَةُ اللَّائِذِينَ، وَ كَهْفُ الْمُؤْمِنِينَ وَ عُرْوَةُ الْمُتَمَسِّكِينَ، وَ بَهَاءُ الْعَالَمِينَ. اللّٰهُمَّ فَأَوْزِعْ لِوَلِيِّكَ شُكْرَ مَا أَنْعَمْتَ بِهِ عَلَيْهِ، وَ أَوْزِعْنَا مِثْلَهُ فِيهِ، وَ آتِهِ مِنْ لَدُنْكَ سُلْطَاناً نَصِيراً، وَ افْتَحْ لَهُ فَتْحاً يَسِيراً، وَ أَعِنْهُ بِرُكْنِكَ الْأَعَزِّ، وَ اشْدُدْ أَزْرَهُ، وَ قَوِّ عَضُدَهُ، وَ رَاعِهِ بِعَيْنِكَ، وَ احْمِهِ بِحِفْظِكَ وَ انْصُرْهُ بِمَلَائِكَتِكَ، وَ امْدُدْهُ بِجُنْدِكَ الْأَغْلَبِ.

یعنی: ”بارالہا! تو نے ہر زمانہ میں ایک ایسے امام کے ذریعہ اپنے دین کی تائید فرمائی ہے، جسے تو نے اپنے بندوں کے لیے نشان راہ قرار دیا اور شہروں میں منارۂ ہدایت بنا کر قائم کیا ، جبکہ تو نے اپنے پیمان اطاعت کو اس کے پیمان اطاعت سے وابستہ کر دیا ، جسے اپنی رضا وخوشنودی کا ذریعہ قرار دیا، جس کی اطاعت فرض کر دی۔ جس کی نافرمانی سے ڈر یا، جس کے احکام کی بجاآوری اور جس کے منع کرنے پر باز رہنے کا حکم دیا۔ اور یہ کہ کوئی آگے بڑھنے والا اس سے آگے نہ بڑھے اور کوئی پیچھے رہ جانے والا اس سے پیچھے نہ رہے۔ وہ پناہ طلب کرنے والوں کے لیے سروسامان حفاظت ،اہل ایمان کے لیے جائے پناہ ،وابستگان دامن کے لیے مضبوط سہارا اور تمام جہان کی رونق وزیبائش ہے۔ بارالہا! اپنے ولی وپیشوا کے دل میں اس انعام پر جو اسے بخشا ہے ادائے شکر کا الہام فرما اور اس کے وجود کے باعث ویسا ہی ادائے شکر کا جذبہ ہمارے دل میں پیدا کر اور اسے اپنی طرف سے ایسا تسلط عطا فرما جس سے ہر طرح کی مدد پہنچے اور اس کے لیے کامیابی وکامرانی کی راہ بآسانی کھول دے اور اپنے مضبوط سہارے سے اس کی مدد فرما۔ اس کی پشت کو مضبوط اور بازو کو قوی کر اور اپنی نظر توجہ سے اس کی حفاظت اور اپنی نگہداشت سے اس کی حمایت فرما اور اپنے فرشتوں کے ذریعہ اس کی مدد اور اپنے غالب آنے والے سپاہ ولشکر سے اس کی کمک فرما۔“

(صحیفہ سجادیہ؛دعائے عرفہ سے اقتباس)

DECLARATION NO: 7334 ISSN2221-1659

QUARTERLY

RELIGIOUS RESEARCH JOURNAL

NOOR-E-MARFAT

واقعہ کربلا کا شمار ان حقائق میں سے ہوتا ہے جو ہر دور میں، اس دور کے تقاضوں کے مطابق، اپنی تفسیر خود پیش کرتے ہیں۔ یہ بابرکت شجر ہر دور کے انسانوں کو ان کے حالات وضروریات کے مطابق ہدایت کا عظیم ثمر عطا کرتا ہے۔۔۔کربلا وہ پاکیزہ درخت ہے جس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں پیوست اور شاخیں ثریا کی بلندیوں کو چھو رہی ہیں اور یہ درخت ہمیشہ سایہ دار اور ہر وقت پھل دے رہا ہے۔ کربلا، جہاں انسانی احساسات وعواطف رکھنے والوں کے لئے تصویرِ غم ہے، وہاں اہلِ عرفان کے لئے عبد ومعبود کے درمیان امر اور امتثال کا انتہائی حسین، جمالیاتی منظر ہے۔ یہ، دین داروں کے لئے معبود کی بارگاہ میں ایک عابد کا مخلصانہ سجدہ شکر بجالانے کی عالی ترین مثال اور اہلِ دنیا کے لئے دنیاداری کے سنہری اصولوں کا مرقع ہے۔

کربلا، سیاست دانوں کے لئے رہنما اور عوام کے لئے ہدایت کا روشن چراغ ہے۔ کربلا، انسانی حقوق کے علمبرداروں کے لئے انسانی حقوق کی پاسداری کا عظیم شاہکار اور اخلاقی اقدار کا دم بھرنے والوں کیلئے اخلاقی ضابطوں کی ہر حال میں پابندی کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ کربلا، خالقِ کائنات کے حقِ اطاعت کی ادائیگی کی عظیم الشان مثال اور سیر وسلوک کی وادیوں میں سفر کرنے والوں کے لئے انقطاع الی اللہ وقرب الٰہی کی معراج ہے۔

نمت

نور الہدیٰ مرکز تحقیقات، نور الہدیٰ ٹرسٹ، محلّہ سادات، بارہ کہو، اسلام آباد

Ph:051-2231937 www.nmt.org.pk|www.nht.org.pk